Regd. L. No. 7243

Phone, 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اکتوبر 1969

سچے موتی

نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

کچھ لوگ ایک کشتی میں سوار ہوتے۔ ان میں سے کچھ اوپر کے حصے میں پہنچ گئے اور کچھ نچلے حصے میں رہے۔ جو نچلے حصے میں تھے وہ پانی لینے کیلئے اوپر گئے تو اوپر والوں نے انہیں یہ کہہ کر پانی لینے سے روک دیا کہ اس سے ہمیں تکلیف ہوتی ہے۔ نیچے والوں نے کہا بہت اچھا۔ ہم نیچے سوراخ کر کے پانی حاصل کر لیں گے۔ اب اگر ان نیچے والوں کو (پانی دے کر) اس سے روکا نہ جائے تو ظاہر ہے کہ نیچے اور اوپر والے سب غرق ہو جائینگے۔ اگر انہیں (پانی دیکر) اس سے روک دیا جائے تو سب بچ جائیں گے۔ (ترمذی۔ باب الفتن)

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ -

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ **طلوعِ اسلام** لاہور

ٹیلیفون
۸۰۸۰۰

خط و کتابت
ناظم۔ ادارہ طلوعِ اسلام
۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

قیمت فی پرچہ
پاکستان ——— ایک روپیہ
ہندوستان
ڈیڑھ روپیہ

بدلِ اشتراک
سالانہ ——— پاکستان ——— دس روپے
سالانہ ——— ہندوستان ——— پندرہ روپے
سالانہ ——— غیر ممالک ——— ایک پونڈ

جلد (۲۲) | اکتوبر ۱۹۶۹ء | نمبر (۱۰)

فہرست

۱ لمعات ——— ۲
۲ شذرات ——— ۱۲
۳ حقائق و عبر ——— ۱۹
۴ طلوعِ اسلام کالج ——— ۲۳
۵ رنگینیٔ خونِ شہداء ——— (محترم پرویز صاحب) ——— ۲۵
۶ جماعتِ اسلامی اور اسلامی طریقِ انتخاب ——— (ہشام عادل) ——— ۴۱
۷ نکاح کے شرعی احکام ——— ۵۷
۸ فقہی اصطلاحات ——— (محترم رفیع اللہ صاحب) ——— ۶۷
۹ عربوں کا عالمی کردار ——— (محترم خورشید عالم صاحب) ۷۳ - ۸۰

ایڈیٹر: محمد خلیل۔ ناشر: سراج الحق۔ مقام اشاعت: ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور۔ پرنٹر: شیخ محمد اشرف۔ مطبوعہ: اشرف پریس، ایبک روڈ، لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

پاکستان کا مطلب کیا...؟

علامہ اقبالؒ نے 'مردِ مومن کی بنیادی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ

مردِ خود دارے کہ باشد پختہ کار   با مزاجِ اُو بسازد روزگار
گر نہ سازد با مزاجِ اُو جہاں   می شود جنگ آزما با آسماں
بر کَنَد بنیادِ موجودات را   می دہد ترکیبِ نَو ذرّات را
می کند از قوتِ خود آشکار   روزگارِ نَو کہ باشد سازگار

آج ۱۱ ستمبر ہے جس کی صبح' از خود ہمارے ذہن میں اس مردِ خود دار و پختہ کار کی حسین یاد بیدار کر دیتی ہے جس نے جب دیکھا کہ زمانہ اس ملت کے سازگار نہیں جس کا وہ ایک قابلِ فخر فرزند ہے' تو اس نے اپنے یقینِ محکم' عملِ پیہم' بلندیٔ کردار اور پاکیزگیٔ سیرت سے' زمانے کے دھارے کا رُخ موڑ دیا' اور اس جہانِ ناسازگار کی بنیادوں تک کو اکھیڑ کر اس کی جگہ ایک ایسی دنیا کی بنیاد رکھ دی جو اس ملت کی مقدس آرزوں کو بروئے کار لانے کا ذریعہ بن سکتی تھی۔ کس قدر عظیم تھا یہ انسان۔ کیا بلند مرتبت تھا یہ مردِ مومن۔ اور کیسے درخشندہ تھے اس کے کارنامے۔ جب ہم ایک طرف اپنی تہی دامانی پر نگہ ڈالتے ہیں اور دوسری طرف' اس قسم کے گوہرِ تابدار کی نمود پر' تو بلاساختہ زبان پر آجاتا ہے کہ

تو بہارِ عالمِ دیگرے' زکجا بایں چمن آمدی؟

انہی جیسے انسانوں کی زندگی وہ زندگی ہے جس سے یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ "فطرت الٰہی انسان سے مایوس نہیں ہوتی" اور انہی کی موت وہ موت ہے جس پر نچھاور ہونے کے لئے ہزاروں زندگیاں ہمہ تن

انتظار ہوتی ہیں ۔ طوبیٰ لھم وحسن مآب۔

اس میں شبہ نہیں کہ قائدِ اعظمؒ سے پہلے، ملتِ اسلامیہ ہندیہ کے بہت سے مایہ ناز فرزندوں نے حصولِ آزادی کے لئے سرفروشانہ جدوجہد کی اور بے مثال قربانیوں کی یاد چھوڑی۔ ان سب کی عزت اور احترام ہمارے دل میں ہے۔ لیکن یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ ان کی جدوجہد کا منتہیٰ مسلمانوں کو غیر مسلموں کے مظالم سے نجات دلانا، یا زیادہ سے زیادہ ملک کو غیر ملکی فرمانرواؤں کی حکومت سے آزاد کرانا تھا۔ مسلمانانِ ہند کے لئے ایک آزاد اسلامی مملکت کا قیام ان کے پیشِ نظر نہیں تھا۔ اس وقت (اس موضوع کے متعلق) تاریخی تفصیلات میں جانے کا موقعہ نہیں اسلئے ہم صرف چند ارشادات پر اکتفا کرتے ہیں (مثلاً) علمائے دیوبند کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ آزادی کی جنگ میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ لیکن آزادی سے انکا مقصود وطن (یعنی ہندوستان) کو انگریز کی غلامی سے آزاد کرانا تھا۔ اور بس۔ ۱۹۶۳ء کی بات ہے کہ (مشہور قومیت پرست) اخبار مدینہ (بجنور) کی ۱۷ اپریل کی اشاعت میں، اسرار احمد آزاد صاحب کے قلم سے ایک مبسوط مقالہ شائع ہوا تھا جس کی شہ سرخیاں حسبِ ذیل تھیں۔

علمائے اسلام اور دارالعلوم دیوبند کا جنگِ آزادی میں حصہ۔

یہ الزام بے بنیاد ہے کہ علمائے ہند اس ملک میں "سلطنتِ اسلامیہ" کے لئے کوشاں رہے۔

اس مقالہ میں، بڑی شرح و بسط سے یہ ثابت کیا گیا تھا کہ علمائے دیوبند کے پیشِ نظر کبھی بھی یہ مقصد نہیں رہا کہ ہندوستان میں اسلامی سلطنت قائم کیجائے۔ ان کے پیشِ نظر ہمیشہ جمہوری انداز کی سیکولر حکومت کا قیام رہا۔ اس سلسلہ میں صاحبِ مقالہ نے لکھا تھا۔

دارالعلوم دیوبند کے ساتھ تعلق رکھنے والے علماء نے "آزاد ہندوستان کی" جو پہلی جلاوطن حکومت کابل میں قائم کی تھی اس کا صدر راجہ مہندر پرتاپ کو مقرر کیا تھا جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دارالعلوم کے قیام کے بعد پچاس سال کی مدت میں حالات میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں ان کے ماتحت دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والے علماء نے کم از کم اس صدی کے آغاز سے ہندوستان میں جمہوری اور سیکولر حکومت کے قیام کو اپنا واضح نصب العین قرار دے لیا تھا۔

اس سے یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ جب اقبالؒ نے، مسلمانانِ ہند کے لئے ایک آزاد اسلامی مملکت

کا تصور پیش کیا اور قائدِ اعظمؒ نے اس تصور کو محسوس پیکر عطا کرنے کے لئے مجاہدانہ قدم اٹھایا تو ان علماء نے (بجز معدودے چند جنہیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے) مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کیوں کی؟ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے علماء کے سامنے صدیوں سے مملکت کا تصور ہی سیکولر رہا ہے ــــ یعنی امورِ مملکت بادشاہ کے سپرد، اور عقاید و عبادات (یا زیادہ سے زیادہ) شخصی قوانین علماء کی تحویل میں۔ یہ علامہ اقبالؒ تھے جنہوں نے ہمیں سب سے پہلے یہ تصور دیا کہ (۱) مسلمان اپنے دین کی بنا پر تمام غیر مسلموں سے الگ ایک منفرد قوم ہیں۔ اور (۲) اسلامی زندگی صرف اسی صورت میں بسر ہو سکتی ہے جب مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت ہو۔ جس میں وہ قوانینِ خداوندی نافذ کر سکیں۔ تحریکِ پاکستان کی جنگ درحقیقت اسلام کے متعلق ان دو (باہم دگر متضاد) تصورات کی جنگ تھی ــــ سیکولر اسلام کا تصور جس کے علمبردار علماء حضرات تھے، اور نظریاتی مملکت کا تصور جسے علامہ اقبالؒ نے پیش کیا اور جسے ایک زندہ حقیقت بنانے کے لئے قائدِ اعظمؒ میدان میں آئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مسلمانوں کی آزاد مملکت کے قیام کے لئے، ہندی سیاست میں پہلا قدم انگریز کی غلامی سے آزادی تھی۔ لیکن علماء کے نزدیک یہی منزلِ مقصود تھی، اور تحریکِ پاکستان کے علمبرداروں کے نزدیک یہ منزل تک پہنچنے کا پہلا قدم تھا ــــ ان ہر دو تصورات کی جنگ کا نمایاں ترین اور شدید ترین مظاہرہ علامہ اقبالؒ اور (مولانا حسین احمد مدنی مرحوم) کا وہ تصادم تھا جسے (بجا طور پر) معرکۂ دین و وطن سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس معرکہ میں جب (مولانا) مدنی نے کہا کہ جنگِ آزادی سے مقصود، وطن کو انگریزوں کی غلامی سے چھڑانا ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں، تو علامہ اقبالؒ نے (یوں کہئے کہ بسترِ مرگ سے) یہ جواب دیا کہ

> مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کو ختم کرنا ہمارا فرض ہے۔ لیکن اس آزادی سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں بلکہ ہمارا اولین مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقتور بن جائے۔ اس لئے مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہو سکتا جس کی بنیادیں انہی اصولوں پر ہوں جن پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا چہ معنی دارد؟ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے۔ لیکن اگر آزادیٔ ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دارالکفر اب ہے ویسا ہی رہے یا اس سے بھی بدتر بن جائے تو مسلمان ایسی آزادیٔ وطن پر ہزار مرتبہ لعنت بھیجتا ہے۔ ایسی آزادی کی راہ میں لکھنا بولنا، روپیہ خرچ کرنا

لاٹھیاں کھانا، جیل جانا، گولی کا نشانہ بننا، سب کچھ حرام اور قطعی حرام سمجھتا ہے [1]

علامہ اقبالؒ کو علما حضرات کی اس ذہنیت سے اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ بستر سے اٹھ ہی نہ سکے اور اس علمِ آزادی کو قائداعظمؒ کے ہاتھ میں دے کر ہم سے رخصت ہو گئے۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ۔ اس کے بعد قائداعظمؒ نے جو نو سال تک متواتر جنگ لڑی ــــ اور جس میں ان کے مدمقابل، انگریز اور ہندو کے علاوہ قومیت پرست علماء، مجلسِ احرار، سرخ پوش، انصار، جماعتِ اسلامی سب شامل تھے۔ تو اسی مقصد کے حصول کے لئے۔ یعنی ایک ایسے خطۂ زمین کے حصول کے لئے جس میں مسلمان، خدا کے احکام و قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکے۔ انہوں نے (جون ۱۹۴۵ء میں) فرنٹیئر مسلم سٹوڈنٹس کے نام اپنے پیغام میں، علامہ اقبالؒ کے مندرجہ صدر بیان کو ان الفاظ میں دہرایا کہ

> پاکستان سے مطلب یہی نہیں کہ ہم غیر ملکی حکومت سے آزادی چاہتے ہیں۔ اس سے حقیقی مراد مسلم آئیڈیالوجی ہے جس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ ہم نے صرف اپنی آزادی حاصل نہیں کرنی، ہم نے اس قابل بھی بننا ہے کہ ہم اس کی حفاظت بھی کر سکیں اور اسلامی تصورات اور اصولات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔

انہوں نے ہندوؤں، انگریزوں اور ان کے ساتھ فریب خوردہ اور فریب دہندہ علماء کو بار بار سمجھایا کہ اسلام ایک مذہب نہیں جسے ہر قسم کی حکومت میں آزادی حاصل ہو سکتی ہے۔ اسلام "دین" ہے۔ جو اپنی آزادی کے لئے آزاد مملکت کا متقاضی ہے۔ انہوں نے (۷ر نومبر ۱۹۴۵ء کو) ایڈورڈس کالج پشاور میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔

> ہم دونوں قوموں (ہندوؤں اور مسلمانوں) میں صرف مذہب کا فرق نہیں ہمارا کلچر ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ہمارا دین ہمیں ایک ضابطۂ حیات دیتا ہے۔

---

[1] جماعتِ اسلامی والے کہتے ہیں کہ مودودی صاحب نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت اسلئے کی تھی کہ اس تحریک سے مقصود صرف مسلمانوں کی انگریزوں کی غلامی سے آزادی تھی اور مودودی صاحب ایسی آزادی کے طالب تھے جس میں اسلام بھی آزاد ہو۔ ہم ان حضرات سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ علامہ اقبالؒ کے اس شہرۂ آفاق بیان سے (جو مارچ ۱۹۳۸ء میں دیا گیا تھا اور جس نے ملک میں تہلکہ مچا دیا تھا)، پٹھانکوٹ میں بیٹھے ہوئے مودودی صاحب کو اتنا بھی معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ تحریکِ پاکستان سے کس قسم کی آزادی مقصود تھی؟

جو زندگی کے ہر شعبے میں ہماری راہ نمائی کرتا ہے۔ ہم اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔

اس "ضابطۂ حیات" کی تشریح کرتے ہوئے، انہوں نے، اسی سال، مسلمانانِ ہند کے نام عید کے پیغام میں کہا۔

اس حقیقت سے ہر مسلمان باخبر ہے کہ قرآن کے قوانین صرف مذہبی اور اخلاقی حدود تک محدود نہیں۔ گبن نے ایک مقام پر لکھا ہے "بحرِ اطلانطک سے لیکر گنگا تک ہر جگہ قرآن کو ضابطۂ حیات کے طور پر مانا جاتا ہے جس کا تعلق صرف الٰہیات تک نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے سول اور فوجداری قوانین کا ضابطہ ہے جس کے قوانین نوعِ انسان کے تمام اعمال و احوال کو محیط ہیں اور وہ قوانین، منشائے خداوندی کے مظہر ہیں"۔۔۔۔

اس حقیقت سے سوائے جہلا کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا ضابطۂ اخلاق ہے جو مذہب، معاشرت، تجارت، عدالت، فوج، سول اور فوجداری کے تمام قوانین کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ مذہبی رسوم ہوں یا روزمرہ کی زندگی کے عام معاملات۔ روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا۔ اجتماعی واجبات کا مسئلہ ہو یا انفرادی حقوق کا۔ ان تمام معاملات کے لئے اس ضابطہ میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لئے نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ ہر مسلمان کو قرآن کا نسخہ اپنے پاس رکھنا چاہیئے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جانا چاہیئے۔

یہ ۱۹۴۵ء کی بات ہے۔ انہوں نے ۱۹۴۱ء میں حیدرآباد (دکن) میں عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء کے اس استفسار پر (کہ جس اسلامی مملکت کے لئے آپ جد و جہد کر رہے ہیں اسکی امتیازی خصوصیت کیا ہے) وہ جامع بیان دیا جس سے بہتر اسلامی سیاست کا شارح شاید کہیں اور مل سکے۔ (چونکہ یہ بیان، چند صفحات آگے چل کر، پرویز صاحب کے خطاب میں سامنے آرہا ہے، اسلئے ہم اسے اس مقام پر نقل کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔ قارئین اسے وہاں ملاحظہ فرمالیں) اس میں انہوں نے کہا تھا کہ

اسلامی حکومت درحقیقت قرآنی حکمرانی کا نام ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ ہندوستان کے مسلمان مختلف پارٹیوں اور فرقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ان میں

نسلی، صوبائی اور لسانی تفریقات بھی موجود تھیں۔ حتیٰ کہ خود پاکستان کو دو ایسے خطوں پر مشتمل ہونا تھا جن میں ہزاروں میل کا فاصلہ تھا۔ سوال یہ تھا کہ ان وجوہِ اختلاف کے باوجود وہ کونسی قدر مشترک تھی جو اس قسم کے باہمد گر متضاد عناصر کو ایک نقطہ پر جمع کر سکتی تھی۔ اس کا جواب قائدِ اعظمؒ کے الفاظ میں سنیئے۔ انہوں نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس (۱۹۴۳ء) میں پہلے خود ہی یہ سوال اٹھایا کہ

وہ کون سا رشتہ ہے جس میں منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں،
وہ کون سی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے؟
وہ کون سا لنگر ہے جس سے اس امت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے؟

اس کے بعد خود ہی اس سوال کا جواب ان الفاظ میں دیا کہ

وہ بندھن، وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر۔ خدا کی کتاب عظیم قرآن کریم ہے۔
مجھے یقینِ محکم ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائینگے، ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہوتی جائے گی۔

ہم نے قائدِ اعظمؒ کی تقاریر اور بیانات میں سے یہ چند ایک اقتباسات مثال کے طور پر پیش کئے ہیں۔ کیا ان سے واضح نہیں ہو جاتا کہ پاکستان کا تصور دینے والے اور اسکے حصول کی خاطر جدوجہد کرنے والوں کے نزدیک پاکستان سے مطلب کیا تھا؟

ضمناً اس قدر واضح تصریحات کے باوجود مودودی صاحب مسلمانوں کو یہ کہہ کر بہکانے (یا اپنے عقیدت مندوں کو فریب دینے کی کوشش کیا کرتے) تھے کہ لیگ کے کسی ذمہ دار لیڈر نے یہ نہیں کہا کہ پاکستان میں اسلامی حکومت قائم کی جائے گی۔ حتیٰ کہ وہ یہ کچھ کہنے میں بھی کوئی جھجک یا ندامت محسوس نہیں کیا کرتے تھے کہ

افسوس کہ لیگ کے قائدِ اعظمؒ سے لیکر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے پرکھتا ہو۔

(ترجمان القرآن، ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ)

قائدِ اعظمؒ نے پاکستان کا یہ مطلب و مقصد تحریکِ پاکستان کے دوران ہی نہیں بتایا۔ انہوں نے حصولِ پاکستان کے بعد اکتوبر ۱۹۴۸ء میں خالق دینا ہال کراچی میں حکومت کے افسروں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

پاکستان کا قیام جس کے لئے ہم گذشتہ دس سال سے مسلسل کوشش کر رہے تھے،

اب خدا کے فضل سے ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آچکا ہے لیکن ہمارے لئے اس آزاد مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں تھا بلکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہمیں ایک ایسی مملکت مل جائے جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں اور جس میں ہم اپنی روشنی اور ثقافت کے مطابق نشو و نما پا سکیں اور جہاں اسلام کے عدلِ عمرانی (سوشل جسٹس) کے اصول آزادانہ طور پر روبہ عمل لائے جا سکیں۔

قائداعظمؒ کو شروع ہی سے اس کا علم و احساس تھا کہ شیر شکار مارتا ہے اور اس کے بعد گیدڑ اور کرگس ملبے کھانے کے لئے لپک پڑتے ہیں۔ وہ پاکستان کو ان گیدڑوں اور کرگسوں سے بچانا چاہتے تھے جنہیں —
(۱) سرمایہ داری کے خون آشام' اور (۲) تھیاکریسی کے اقتدار پسند' یعنی مذہب کی آڑ میں حکومت پر قابض ہونے کے آرزومند کہا جاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ ساری عمر ان دونوں اسلام دشمن قوتوں کے خلاف مصروفِ جہاد رہے۔ (طلوع اسلام کے صفحات پر اس سلسلہ میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے)۔ نظامِ سرمایہ داری کے سلسلہ میں انہوں نے ۱۹۳۱ء میں 'فرانسس ینگ ہسبنڈ' سے جو کچھ کہا تھا اس کا ملخص یہ تھا کہ بالشویت کے معاشی نظام کو اگر قرآنی فلسفۂ زندگی کی بنیادوں پر استوار کر دیا جائے تو وہ عین مطابق اسلام ہو جاتا ہے۔ یہی ان کے نزدیک 'اسلامی مملکت کا معاشی نظام ہونا چاہیئے۔ اسی نظام کو "سوشل ڈیماکریسی" کے نام سے تعبیر کر کے انہوں نے ۱۹۳۷ء میں قائداعظمؒ کے نام اپنے خط میں لکھا تھا کہ

> اسلامی آئین کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو اس سے کم از کم ہر فرد کو سامانِ پرورش ضرور مل جاتا ہے۔ اگر ہندوؤں نے سوشل ڈیماکریسی کو اپنے ہاں قبول کر لیا تو ہندومت کا خاتمہ ہو جائے گا لیکن اسلام کے لئے سوشل ڈیماکریسی کو ایسے انداز سے قبول کر لینا جس سے یہ اس کے اصولوں سے نہ ٹکرائے، اسلام میں کسی تبدیلی کے مرادف نہیں ہو گا بلکہ اس سے مفہوم یہ ہو گا کہ ہم اسلام کو پھر سے اس منزہ صورت میں اختیار کر رہے ہیں جیسا کہ وہ صدرِ اول میں تھا۔

قائداعظمؒ نے اسلامی نظام کی اس روح کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ۱۹۴۳ء میں 'آل انڈیا مسلم لیگ' کے سیشن میں برملا اعلان کیا کہ

> اس مقام پر میں زمینداروں اور سرمایہ داروں کو بھی متنبہ کر دینا چاہتا ہوں کہ وہ ایک ایسے فتنہ انگیز ابلیسی نظام کی رو سے جو انسان کو ایسا بدمست کر دیتا ہے کہ وہ

> کسی معقول بات کے سننے کے لئے آمادہ ہی نہیں ہوتا' عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی پر رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ عوام کی محنت کو غصب کر لینے کا چسکا ان کے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکا ہے...... میں اکثر دیہات میں گیا ہوں۔ وہاں میں نے دیکھا ہے کہ لاکھوں خدا کے بندے ہیں جنہیں ایک وقت بھی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔ کیا اسی کا نام تہذیب ہے؟ کیا یہی پاکستان کا مقصد ہے؟ اگر پاکستان سے مقصود یہی ہے تو میں ایسے پاکستان سے باز آیا۔ اگر ان سرمایہ داروں کے دماغ میں ہوش کی ذرا سی بھی رمق باقی ہے تو انہیں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ چلنا ہوگا۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان کا خدا حافظ۔ ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔

جہاں تک تھیاکریسی کا تعلق ہے' انہوں نے فروری ۱۹۴۸ء میں اہل امریکہ کے نام ایک پیغام براڈکاسٹ کیا تھا جس میں کہا تھا کہ

> آئینِ پاکستان مرتب کرنے کے سلسلہ میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں ان کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں لیکن کچھ بھی ہو' یہ مسلّمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دیدی جاتی ہے کہ وہ (بزعم خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔

مسلمانانِ ہند کی جہاں یہ انتہائی خوش بختی تھی کہ انہیں ایسے وقت میں جب ان کا مستقبل اس قدر تاریک ہو رہا تھا' اس قسم کا رہبرِ فرزانہ مل گیا جس نے انہیں ایک عظیم مملکت کا مالک بنا دیا' وہاں ملتِ پاکستانیہ کی انتہائی بدقسمتی تھی کہ وہ رہبرِ فرزانہ' اس مملکت کو اپنے تصورات کے سانچے میں ڈھالنے سے پہلے ہی ان سے جدا ہو گیا اور اس کے بعد' اس شیرِ نیستاں کے مارے ہوئے شکار پر گیدڑوں اور کرگسوں نے یلغار کر دی۔ چنانچہ اب حالت یہ ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے تحریکِ پاکستان کی اس قدر مخالفت کی تھی' یہاں سب سے زیادہ معتبر بنے ہوئے ہیں اور سرمایہ داری اور تھیاکریسی' جن سے نجات حاصل کرنے کے لئے اس مملکت کا وجود عمل میں آیا تھا اور جن کا ہمیشہ آپس میں گٹھ جوڑ ہوتا ہے' مملکت پر مسلط ہو رہی ہے۔ وہ قرآن جس کی حکمرانی کے لئے اس خطۂ زمین کو حاصل کیا گیا تھا' اس کا نام لینے والوں کے خلاف کفر کے فتوے لگتے ہیں اور سرمایہ داری کی مخالفت کرنے والوں کے متعلق اعلان ہوتا ہے کہ ان کی زبانیں گدی سے کھینچ لی جاتیں۔ ملک میں جس قدر مفلوک الحالی اور درماندگی' اور ان کی وجہ سے خلفشار اور انتشار پایا جاتا ہے۔ دوسری طرف' تعلیم یافتہ نوجوانوں میں جس قدر مذہب گزیدگی اور سرکشی و شوریدہ سری کا جنون ابھر رہا ہے' ان کے

بنیادی اسباب یہی دو ہیں۔ یعنی سرمایہ دارانہ نظام کی حمایت اور مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اسلام کا غلط تصور۔ اور انہی کے ہاتھوں ملک تباہ ہو رہا ہے۔

ایک طرف یہاں اس قسم کے حالات پیدا ہو رہے ہیں اور دوسری طرف کیفیت وہ ہے جسے کبھی اقبال نے ایک آہ سحرگہی کے ساتھ ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس گئے ہیں کسی مردِ راہ داں کے لئے

جوں جوں حالات ناسازگار ہوتے جاتے ہیں قائد اعظمؒ کی عظمت زیادہ اجاگر ہوتی جاتی ہے کہ انہوں نے جس بھنور سے کشتی ملت کو صحیح و سلامت نکال کر کنارہ تک پہنچایا تھا، وہ موجودہ تلاطم انگیزیوں سے کہیں زیادہ تباہ کن اور خطرناک تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج اس ستمبر کو ملت کے اس عظیم محسن کی کمی اور بھی شدت کے ساتھ محسوس ہو رہی ہے۔ ملت کا وہ عظیم محسن جس کی دیانت پر دوست اور دشمن سب نے خراجِ تحسین پیش کیا۔ دنیا کے سب سے زیادہ چھپنے والے اخبار لنڈن ٹائمز نے لکھا تھا۔

> قائد اعظمؒ نے اپنے آپ کا ایک بہترین نمونہ پیش کر کے اپنے اس دعویٰ کو ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ ان میں وہ ذہنی لچک نہیں تھی جو انگریز کے نزدیک ہندوستانیوں کا خاصہ ہے۔ ان کے تمام خیالات ہیرے کی طرح قیمتی مگر سخت، واضح اور شفاف ہوتے تھے۔ ان کے دلائل میں ہندو لیڈروں جیسی حیلہ سازی نہیں تھی بلکہ وہ جس نقطۂ نظر کو اپنا ہدف بناتے تھے اس پر براہ راست نشانہ باندھ کر وار کرتے تھے۔ وہ ایک ناقابلِ تسخیر حریف تھے۔

امریکہ کے سابق صدر، مسٹر ٹرومین نے کہا تھا۔

> دولتِ پاکستان کا معمار۔ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کا بانی۔ مجھے یقین ہے کہ مسٹر جناح کی غیر معمولی قیادت کی یاد، حکومتِ پاکستان اور اس کے عوام کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہو گی۔

مسز سروجنی نائیڈو نے قائد اعظمؒ کے بارے میں ان ناقابلِ فراموش الفاظ میں اپنی شردھا کے پھول بکھیرے تھے۔

> میں قائد اعظمؒ کے متعلق وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ انہیں کسی قیمت پر بھی خریدا نہیں جا سکتا تھا۔

دوست، دشمن، سب اس بطلِ عظیم کی تابناک زندگی اور درخشندہ کامیابی کی، اپنے اپنے انداز میں تعریف کرتے تھے۔ لیکن اسی دنیا میں ایک شخص ایسا بھی تھا جس کے سینے میں اس قابلِ رشک کامیابی پر آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے اور آتش فشاں پہاڑ کے دھانے کی طرح اس کے منہ سے ابل ابل کر باہر آ رہے تھے۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد مودودی صاحب کے ماہنامہ ترجمان القرآن کا پہلا شمارہ جون ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ اس میں مسلمانوں کی سیاست پر تبصرہ کرنے کے بعد جس میں تحریکِ پاکستان لامحالہ سرفہرست تھی، لکھا گیا تھا۔

> یہ بحث ان لوگوں کا منہ کالا کر دینے والی ہے جنہوں نے پچھلی ربع صدی میں ہماری سیاسی تحریکوں کی قیادت فرمائی۔

اور اس کے بعد اگست ۱۹۴۸ء کے شمارہ میں لکھا تھا۔

> اس پورے گروہ میں ایک کوئی، کن بھی نہ نکلا جو بازی کھو دینے کے بعد مر دے سکتا۔ ہماری جماعت بازی گروں سے پٹی پڑی تھی جنہوں نے عجیب عجیب قلابازیاں کھا کر دنیا کو بودی سیرت اور کھوکھلے اخلاق کا تماشا دکھایا اور اس قوم کی رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا دی جس کے وہ نمائندہ بنے ہوئے تھے۔

جب یہ پرچہ شائع ہوا تو وقت قائداعظمؒ کا دمِ واپسیں تھا۔

۱۱ ستمبر کو حساس قلوب کے یہ زخم بھی از سرِ نو تازہ ہو جاتے ہیں۔

نومبر کا پرچہ

چونکہ اکتوبر کے تیسرے ہفتہ میں طلوعِ اسلام کی سالانہ کنونشن منعقد ہو رہی ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ نومبر کا پرچہ کچھ دنوں کی تاخیر سے شائع ہو۔ قارئین نوٹ فرمائیں!

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

شذرات

لمحۂ فکریہ

مسجدِ اقصیٰ کی آتش زدگی کا قیامت خیز و روح فرسا حادثہ آیا اور گزر گیا۔ اُن دو چار دنوں میں اخبارات کی سُرخیوں سے ایسا نظر آتا تھا کہ اب اسرائیل کی مملکت ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کے یہودی، بس چند ہی دن کے مہمان ہیں۔ ساٹھ ستر کروڑ مسلمانوں کا بحرِ ذخّار بے پناہ طغیانیوں کے ساتھ تلاطم خیز ہوگا اور انہیں خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گا، اور اس کے بعد اس غاصب اور ظالم قوم کے فقط افسانے دنیا میں باقی رہ جائیں گے۔ آتشناک مضامین لکھے گئے۔ شعلہ بار تقریریں ہوئیں۔ ولولہ انگیز نظمیں پڑھی گئیں۔ زلزلہ خیز ریزولیوشن پاس ہوئے۔ اور اس کے بعد قوم پھر، حسبِ معمول اپنے معمولات میں مصروف ہو گئی۔ زیادہ سے زیادہ ہوا یہ کہ اس مسئلہ کو سلامتی کونسل میں پیش کرنے کا فیصلہ کیا گیا تاکہ یہ المیہ کشمیر کے مصرعۂ اول کا مصرعۂ ثانی بن سکے اور یوں اس "حسین و سادہ و رنگیں" بیت کی تکمیل ہو جائے۔

ملّتِ اسلامیہ کی تاریخ میں ایک دَور یہ ہے۔ اور ایک دور وہ تھا جب جزیرہ عرب کی ایک کشتی سے ایک مظلوم لڑکی نے پکارا کہ یا امیر المومنین! مجھے ظالموں کے پنجۂ استبداد سے بچائیے۔ اور ابھی اس آواز کی صدائے بازگشت بھی فضا میں تحلیل نہیں ہونے پائی تھی کہ امیر المومنین کی فوجیں اس مظلوم کی حمایت کے لئے ساحلِ سندھ پر موجود تھیں۔

اُس وقت مسلمانوں کی ایک ہی بڑی سلطنت تھی۔ آج بیسیوں ہیں۔ اُس وقت اُنکی کل آبادی شاید دو چار کروڑ ہوگی، آج خدا کے فضل سے یہ ساٹھ ستر کروڑ ہیں۔ اور انکے مقابلہ میں ساری دنیا کے یہودیوں کی آبادی کوئی ڈیڑھ کروڑ۔ اور اسرائیلی حکومت کی کل آبادی، لاہور شہر کی آبادی کے برابر یا اس سے چند نفوس زیادہ۔

کیا یہ سوال غور طلب نہیں کہ ہمارے ساتھ یہ کیا ہوا؟

اس سوال کے جوابات سینکڑوں دیئے جا سکتے ہیں لیکن ان سب کی علت ایک ہی ہے

جب قریشِ مکہ کو مسلمانوں کی مٹھی بھر جماعت کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست ہوئی تو انہوں نے اس امر کی تحقیق کرنی چاہی کہ اس شکست کے اسباب کیا تھے۔ قرآن کریم نے کہا کہ وہ اس باب میں اور تو بہت کچھ کہیں گے لیکن اس شکست کے حقیقی سبب کی طرف ان کی نگاہ کبھی نہیں جائے گی اور وہ حقیقی سبب یہ ہے کہ انھم قوم لا یفقھون۔ (۸/۶۵) یہ وہ قوم ہے جو سوچتی نہیں۔

سو آپ غور کیجئے کہ جس قوم پر صدیوں سے سوچنا حرام قرار دے رکھا ہو، وہ دنیا میں عزت کی زندگی کیسے بسر کر سکتی ہے؟ ہماری حالت یہ ہے کہ ہماری مذہبی پیشوائیت ہمیشہ قوم کے جذبات کو مشتعل کرتی رہتی ہے اور جو شخص کبھی سوچنے کی کوشش کرتا ہے اس پر کفر کے فتوے صادر کر دیتی ہے۔

جس قوم کی سوچ کے پاؤں میں اس قسم کی محکم زنجیریں ڈال دی گئی ہوں، اس کا شمار زندہ قوموں کی فہرست میں کیسے ہو سکتا ہے؟

———— (۰) ————

۲۔ ایک عبرت انگیز سزا

طلوعِ اسلام ایک عرصہ سے پکارتا چلا آ رہا تھا کہ بچوں کو اغوا کر کے لے جانا، قتل سے بھی زیادہ اذیت رساں اور جگر سوز جرم ہے۔ اس لئے اس جرم کے مرتکبین کو ایسی سنگین سزا دینی چاہیئے جو دوسروں کے لئے عبرت کا موجب بنے۔ مقامِ تشکر ہے کہ مارشل لاء حکام نے اس جرم کی سنگینی کا احساس کیا اور ایک ایسے سنگدل مجرم کو جس نے (راولپنڈی میں) ایک تین سالہ بچی کا اغوا کیا تھا، پھانسی کی سزا دی۔ ہم ان حکام کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہوئے استدعا کریں گے کہ وہ اپنی اس مہم کو جاری رکھیں اور اغوا کے ہر مجرم کو اسی قسم کی سزا دیں۔ ہمیں امید ہی نہیں بلکہ یقین ہے اس قسم کی عبرتناک سزاؤں سے اغوا کے لرزہ انگیز اور انسانیت سوز جرائم معدوم نہیں تو نادر ضرور ہو جائیں گے اور یہ انسانیت پر بہت بڑا احسان ہو گا۔

———— (۰) ————

۳۔ ایک ظالم گبر و غاصب کُش کی وفات

ظلم کہیں بھی اور کسی کے ہاتھوں سے بھی سرزد ہو، بارگاہِ خداوندی میں بدترین معصیت اور میزانِ انسانیت میں ناقابلِ معافی جرم ہے۔ اور جو شخص بھی ظلم کو روکنے کے لئے کچھ کرتا ہے، وہ نوعِ انسانی سے خراجِ تحسین

حاصل کرنے کا مستحق۔ حضور نبی اکرمؐ نے جہاد کا مقصد ہی یہ بتایا ہے کہ اس سے ظالم کی کلائی مروڑ کر اسے انصاف کے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ ظلم، ایک فرد پر بھی سنگین جرم ہے لیکن جب کسی مستبد غاصب قوم کی طرف سے کسی کمزور قوم پر ظلم کیا جا رہا ہو، تو اس جرم کی سنگینی کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ لہذا جو فرد، گروہ یا قوم کسی مظلوم قوم کو ظالم قوم کے پنجۂ استبداد سے چھڑانے کے لئے جد و جہد کرے، وہ ہر بہی خواہِ انسان کی طرف سے مستحق تعریف و ستائش ہے۔

ہمارے دور میں جن افراد نے اجتماعی ظلم کے خلاف، نہ صرف صدائے احتجاج بلند کی بلکہ اسے روکنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی، ان میں شمالی ویت نام کے آنجہانی صدر، ڈاکٹر ہوچی منہ کا نام فہرست رکھا جائے گا۔ جب ہم اس مردِ بیباک کی زندگی پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ورطۂ حیرت میں گم ہو کر رہ جاتے ہیں کہ کس طرح ایک ان پڑھ، محنت کش، خانماں خراب، بے سر و سامان، نحیف و نزار انسان نے بڑی بڑی مستبد سلطنتوں سے ٹکر لی اور انہیں ناکوں چنے چبوا دیئے۔ کس طرح اس کے عزم بلند اور یقین محکم کے سامنے تمرد و سرکشی کے مجسمہ فراعین کو گھٹنوں کے بل جھکنا پڑا۔ قابلِ صد رشک تھی اس مردِ آہن گداز کی زندگی اور درخورِ ہزار افتخار ہے اس جری القلب انسان کی موت۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹر ہوچی منہ کے متعلق بھی اس سے بہتر کچھ نہیں کہا جا سکتا جو اقبالؒ نے کارل مارکس کے متعلق کہا تھا کہ

قلب اُو مومن، دماغش کافر است

اس قسم کے انسانوں کے متعلق ہمارا جی چاہتا ہے کہ ان کا دماغ بھی مومن ہو جاتا تاکہ ان کے ذہنی فیصلے بھی منشائے خداوندی کے مطابق ہوتے۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہو سکا (اور یہ انسانیت کا بہت بڑا زیاں ہے) تو اس کے ذمہ دار ہم ہیں جو ان کے سامنے خدا کا صحیح تصور پیش نہیں کر سکے اور جو غلط تصور ان کے سامنے پیش کیا گیا اس نے انہیں اس سے اِبا پر مجبور کر دیا۔

(+)

۴۔ ایک مفلس قوم کی عیاشیاں

ہم اپنی قوم کے افلاس اور بدحالی کا رونا آئے دن روتے رہتے ہیں لیکن ہماری نگاہ اس مفلس قوم کی مسرفانہ عیاشیوں کی طرف کبھی نہیں جاتی۔ ہم شکرگزار ہیں ڈاکٹر عثمانی صاحب کے جنہوں نے حال ہی میں کراچی میں منعقدہ ایک تقریب میں تقریر کرتے ہوئے یہ حیرت انگیز انکشاف فرمایا کہ، یہ مفلس اور قلاش قوم، ایک سال میں ۔۔۔

(۱) چھتیس کروڑ روپے کے پان چبا کر تھوک دیتی ہے۔

(۲) سو کروڑ روپے کے سگریٹ پھونک ڈالتی ہے۔ اور

(۳) چار کروڑ روپے کے مشروبات (کوکا کولا وغیرہ) حلق میں انڈیل لیتی ہے۔

ایسی قوم روٹی کے لئے دوسری قوموں سے بھیک نہیں مانگے گی تو اور کیا کرے گی؟ لیکن شاید خود بھیک مانگنے کے لئے اس قسم کی عیاشیوں کی ضرورت ناگزیر ہو جاتی ہے: دیر کی بات ہے۔ چاندنی چوک (دہلی) میں ایک نہایت غریب، نادار بھکارن بڑھیا، خدا اور رسول کا واسطہ دے کر روٹی کھانے کے لئے دونی مانگ رہی تھی۔ ہمارے ایک ساتھی نے اس کی حالت پر رحم کھا کر اسے دونی دے دی۔ دوسرے ہی ثانیہ میں کیا دیکھتے ہیں کہ وہ بڑھیا حلوائی کی دکان سے دونی کی ربڑی لے کر کھا رہی ہے۔ ہمارے اس دوست کو اس کی اس حرکت (یا شاید اپنی حماقت) پر بڑا غصہ آیا۔ بڑھیا کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ تمہیں شرم نہیں آتی، بھیک مانگ کر دونی لی اور اس کی ربڑی کھا رہی ہو؟ بڑھیا نے نہایت سکون سے جواب دیا کہ اس میں شرم کی کونسی بات ہے۔ اگر میں ربڑی نہ کھاؤں تو سارا دن بھیک مانگنے کے لئے چلاؤں کیسے؟

لیکن وہ تو پھر بھی بھیک کی دونی کی ربڑی کھاتی تھی۔ ہم بھیک مانگ کر اپنا سینہ جلاتے ہیں۔

ہم پوچھنا چاہتے ہیں قوم کے معاشی امور سے متعلق اربابِ بست و کشاد سے کہ کیا، یہ ایک سو چالیس کروڑ روپیہ (سالانہ) کی رقم خطیر بچا کر اس کا غلّہ نہیں خرید جا سکتا؟

—— (٠) ——

۵۔ اسلام خطرہ میں ہے

قرآنِ کریم نے یہ غیر متبدل اصول پیش کیا تھا کہ مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ۔ (۱۳/۱۷) یعنی وہی نظریہ زندگی، وہی نظامِ حیات باقی رہ سکیگا جو تمام نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو گا۔ جو نظام انسانیت کے لئے مضرت رساں ہو گا وہ تباہ ہو کر رہے گا۔ انسانیت کش نظامہائے حیات میں ملوکیت سرِ فہرست آتی ہے۔ اسلام نے اس انسانیت کُش نظامِ تمدن کو تہ و بالا کر کے صحیح انسانیت ساز نظام کی بنیاد ڈالی۔ لیکن مسلمانوں نے کچھ عرصہ بعد پھر اسی نظامِ ملوکیت کو استوار کر لیا اور اسے "آئندہ" ہر حملہ سے محفوظ رکھنے کے لئے اس کے گرد مذہبی پیشوائیت نے تقدس کا حصار کھینچ دیا۔ سلطان کو ظل اللہ علی الارض (زمین پر خدا کا سایہ کہا گیا) اور جمعہ اور عیدین کے خطبات میں، منبرِ رسولؐ پر کھڑے ہو کر، ان بادشاہوں کے حق میں، خلد اللہ ملکہٗ اور ایدہ اللہ بنصرہٖ کی دعائیں مانگی گئیں۔

باطل نظامِ زندگی کو مٹانے کے دو طریق ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کوئی ایسی جماعت اٹھے جو باطل کے نظام کو مٹا کر اس کی جگہ حق کا نظام قائم کرے (جیسا کہ اسلام کے صدرِ اول میں ہوا) اور اگر کوئی جماعت اس مقصد کے لئے نہ اٹھے تو پھر زمانے کے تقاضے جھگڑ بن کر اٹھتے ہیں اور اس قسم کے نظاموں کو خس و خاشاک کی طرح اڑا کر لے جاتے ہیں۔ نقص اس میں یہ ہوتا ہے کہ اس تخریب کے بعد حق کے نظام کی تعمیرِ عمل میں نہیں آتی۔ بایں ہمہ اس سے، نظامِ حق کے قیام کے راستے سے ایک بہت بڑا پتھر ضرور ہٹ جاتا ہے۔

ملوکیت کو مسلمانوں نے مٹانا تھا۔ لیکن جب یہی قوم ملوکیت کو استوار کرنے کے لئے مصروفِ کار و مشغولِ دعا ہو گئی تو پھر زمانے کے تقاضوں کا جھکڑ اٹھا اور اس نے انسانیت کے راستے سے اس جھاڑ جھنکار کو ہٹانا شروع کیا۔ یہ جو ہمارے زمانے میں بادشاہوں کے تاج اس تیزی سے فضا میں اڑتے نظر آ رہے ہیں، یہ فطرت کے اسی تخریبی عمل کا نتیجہ ہے۔ مسلمانوں کو ہر بادشاہت کے خاتمہ پر خوش ہونا چاہیئے کہ جو کام انہیں کرنا چاہیئے تھا وہ (اقبال کے الفاظ میں) "اللہ کے نشتروں[1]" کے ہاتھوں سرانجام پا رہا ہے۔ لیکن یہاں مقطع میں ایک سخن گسترانہ بات ایسی آ پڑی ہے جو تصویر کو الٹا کر کے دکھاتی ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں بلکہ غلط نظامِ سیاست و تمدن کا فطری نتیجہ ہے کہ ملوکیت جہاں جہاں بھی ہے (اور آجکل یہ خیر سے مسلمانوں کے ممالک میں سب سے زیادہ ہے) وہ مغربی سیاست اور امریکی سامراج کا بہت بڑا سہارا رہا ہے۔ اس لئے جہاں کہیں ملوکیت ختم ہوتی ہے امریکی مفاد کی کمر ٹوٹ جاتی ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ جب امریکی مفاد پر زد پڑے گی تو پھر، امریکہ پرست حلقوں میں صفِ ماتم کیوں نہیں بچھے گی۔ اور "اسلام خطرہ میں ہے" کے واویلا کی صدائیں کیوں بلند نہیں ہوں گی!

اسکی تازہ ترین مثال لیبیا کا انقلاب ہے۔ اس انقلاب سے ایک اور بادشاہت کا خاتمہ ہوا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی امریکی سیاست کی بھی کمر ٹوٹی۔ لیبیا امریکی مفاد کا بہت بڑا محافظ ہے۔ اس میں امریکہ نے صرف ایک اڈہ، پچاس کروڑ روپے کی لاگت سے تیار کرایا تھا۔ "واشنگٹن پوسٹ" کے نامہ نگار کے الفاظ میں:

> لیبیا، امریکہ کے باہر، امریکہ کے عظیم ترین معاشی اور عسکری مفادات کے نمائندوں میں سے ایک ہے۔ ہر سویرے ۱۹۶۷ء میں بند ہوتی۔ اس وقت سے تیل کی سپلائی کے لئے مغرب کا سب سے بڑا ذریعہ لیبیا ہے۔ اگر وہاں تیل کی دریافت اور پیداوار اسی پیمانے پر ہوتی رہی تو ایک آدھ سال میں وینزویلا کی جگہ لیبیا ہی دنیا میں تیل کی برآمد کا سب سے بڑا ذریعہ بن جائیگا۔

---

[1] کرتی ہے ملوکیت آثارِ جنوں پیدا ؛ اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہو یا چنگیز

اس وقت ہر چوبیس گھنٹے میں وہاں تیل کے تیس لاکھ پیپے نکلتے ہیں۔ اس پیداوار کا نوّے فیصد حصہ امریکہ کنٹرول کرتا ہے۔

(بحوالہ مشرق۔ لاہور۔ مورخہ ۶۹/۹/۱۰)

اب ظاہر ہے کہ اس حادثہ سے بڑھ کر "اسلام کے لئے خطرہ" کا موجب اور کیا ہو سکتا ہے! چنانچہ جماعت اسلامی کے تازہ ترین ہمنوا، ہفتہ وار "زندگی" کی ۱۵ ستمبر کی اشاعت میں اس حادثۂ عظمیٰ پر واویلا کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> عرب اسرائیل جنگ کے بعد سعودی عرب اور کویت کے ساتھ مل کر لیبیا متعدد عرب ملکوں کو گراں قدر مالی امداد دے رہا ہے۔ لیکن مصر، شام اور عراق کی معیشت سوشلزم کی تباہ کاریوں سے انتہائی شکستہ ہو چکی ہے۔ خوشحال عرب ملکوں کی زیادہ سے زیادہ امداد بھی ان کی معیشت کو سنبھالا نہیں دے سکتی۔ اسلئے اشتراکی قوتوں کا منصوبہ نظر آتا ہے کہ خوشحال عرب ملکوں میں حکومتوں کا تختہ الٹ کر وہاں کا اقتدار سوشلسٹوں کے سپرد کر دیا جائے۔ اس طرح ان زرخیز آمدنی اور فوجی اہمیت کے علاقوں پر قبضہ بھی ہو جائے گا اور وہاں سے اسلام کا قلع قمع بھی کیا جا سکیگا۔[2]

ان حضرات کی طرف سے اس قسم کا واویلا قابلِ فہم ہے۔

حقّہ دارد بخر پالان گرا او!

لیکن ہم ان حضرات پر (ان سے پوری پوری "ہمدردی" کے باوجود) یہ واضح کر دینے پر مجبور ہیں کہ اب مغربی تمدن اور ان اقوام کا غاصبانہ نظام، اس قسم کے تعویذوں اور گنڈوں سے بچ نہیں سکتا۔ فطرت کے قوانین اٹل ہیں اور دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ساحران الوطی کے یہ قلعے اب ڈھے کر رہیں گے۔ "حکیم الامت" نے ۱۹۳۵ء میں جمعیت اقوام (لیگ اوف نیشنز) کے متعلق کہا تھا کہ

بیچاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے
ڈر ہے خبر بد نہ مرے منہ سے نکل جائے

---

[1] "سرمایہ پرست" کہتے ہوئے جھجک کیوں محسوس ہوتی ہے؟

[2] واضح رہے کہ لیبیا کا یہ انقلاب خود وہاں کے مسلمانوں کے ہاتھوں عمل میں آیا ہے۔

تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے ولیکن
پیرانِ کلیسا کی دعا یہ ہے کہ ٹل جائے
ممکن ہے کہ یہ داشتۂ پیرکِ افرنگ
ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائے

زمانہ یہی کچھ آج مغربی استعمار کے متعلق پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ۔

اسلام کے لئے آج سب سے بڑا خطرہ مغرب اور اسکا نظام تمدن و معیشت ہے اور اسے اس خطرہ سے صرف قرآن کا نظام سیاست و معیشت محفوظ رکھ سکتا ہے لیکن چونکہ اس نظام میں ملوکیت اور سرمایہ داری کے ساتھ، مذہبی پیشوائیت کا بھی تختہ الٹ جاتا ہے، اسلئے اسکی سب سے زیادہ مخالفت اس طبقہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ فرعون اور قارون کے ساتھ ہامان کا گٹھ جوڑ ایک حقیقت ابدی ہے اور جب کوئی صاحبِ ضربِ کلیم اٹھتا ہے تو ان تینوں کا خاتمہ بیک وقت ہو جاتا ہے۔

انسانی مسائل کے حل ہیں

عقلِ انسانی آج تک کن کن ارتقائی مراحل سے گزری اور اس نے کہاں کہاں اور کیا کیا ٹھوکریں کھائیں۔ تاریخ انسانی کی یہ عبرت آموز تفصیل آپ کو ... پرویز صاحب کی مشہور کتاب

انسان نے کیا سوچا؟

میں ملے گی!

ہزاروں کتابوں کا نچوڑ۔ افلاطون اعظم سے لیکر آج تک۔ گذشتہ اڑھائی ہزار سال میں دنیا کے چوٹی کے مفکرین، مورخین اور علمائے اخلاقیات و عمرانیات اور ماہرین معاشیات و سیاست نے کیا سوچا؟
اسے پڑھیے اور سوچئے کہ وحی کی روشنی سے روگرداں اور محروم ہو کر نوعِ انسانی
نے اپنے لئے کیا جہنم خرید لیا!

قیمت
بارہ روپے

ادارہ طلوع اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور

حقائق و عبر

اِن کے تصوّر کا خُدا

مودودی صاحب کے درسِ قرآن و حدیث میں موضوع زیرِ بحث دُعا تھا۔ ایک صاحب نے سوال کیا۔ اگر انسان کا مقدر پہلے سے طے ہو چکا ہے تو پھر دعا کے کیا معنی ہیں۔ کیا اللہ تعالیٰ اپنے فیصلے کو بدل دیتا ہے؟ جواب میں فرمایا۔

جہاں PRE - DESTINATION بھی صحیح ہے اور دعا بھی اپنی جگہ درست ہے۔ تقدیر کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بات طے کرنے کے بعد بے بس ہو گیا ہے۔ وہ جس طرح فیصلہ کرتا ہے اسی طرح اس فیصلے کو بدلنے کا اختیار بھی رکھتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ پہلے سے یہ طے کر چکا ہو کہ اگر یہ شخص دعا مانگے گا تو میں اپنے فیصلے کو بدل دوں گا اور اگر دعا نہیں مانگے گا تو میں اس کے ساتھ طے شدہ فیصلے کے مطابق معاملہ کروں گا۔ اس چیز کو اصطلاحاً تقدیرِ معلق کہتے ہیں وہ تقدیر جس میں اللہ تعالیٰ نے ردّ و بدل کی گنجائش رکھی ہو اور تقدیرِ مبرم وہ ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا قطعی فیصلہ ہو کہ اس میں تبدیلی نہیں کی جائے گی۔　　(ایشیا - مؤرخہ ۱۸ جولائی ۱۹۶۹ء)

ایشیا کی ۲۵ جولائی کی اشاعت میں ہے کہ مودودی صاحب نے اپنے اس جواب کی مزید تصریح یوں فرمائی۔

اس حدیث میں ایک اہم سوال کا جواب دیا گیا ہے۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ پہلے سے ایک فیصلہ کر دیتا ہے اور انسان کی تقدیر میں وہ لکھا جاتا ہے تو پھر دعا کا کیا فائدہ؟ ظاہر ہے کہ جب آدمی کے ذہن میں یہ خیال جڑ پکڑ جاتا ہے تو وہ اپنے خدا سے مایوس ہو جاتا ہے اور اس کا کوئی تعلق اپنے خدا سے نہیں رہتا۔۔ یہ حدیث بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے بارے میں آدمی کا یہ تصور درست نہیں ہے۔۔ جو خدا فیصلہ کرتا ہے وہ اپنے فیصلے کو بدلنے کا اختیار بھی رکھتا ہے۔ اگر وہ بادشاہ ہے، حاکم ہے، مختارِ مطلق ہے اور کوئی چیز اسے باندھنے والی نہیں ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ ہاتھ جوڑ کر اس کے آگے معافی مانگیں اور وہ متوجہ نہ ہو۔ قضا عربی زبان میں فیصلے کو کہتے ہیں اور دعا

حقیقت میں درخواست ہے جو اللہ تعالےٰ کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کو پورا اختیار ہے کہ وہ چاہے تو اپنے بندوں کی درخواست قبول کرتے ہوئے اپنے سابقہ فیصلے کو بدل دے اور چاہے تو نہ بدلے۔ لیکن اسکی یہ مرضی بھی اپنی عظیم الشان حکمت کے تابع ہے۔ ایسا نہیں کہ وہ الل ٹپ کسی دعا کو قبول کر لیتا ہے اور کسی کو رد کر دیتا ہے۔

متکلمین نے اسی لئے یہ رائے دی ہے کہ قضا کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قضائے مبرم اور دوسری قضائے معلق۔ قضائے مبرم وہ ہے جس کے متعلق اللہ تعالےٰ نے فیصلہ فرما دیا ہے کہ اسے کسی صورت میں تبدیل نہیں کرونگا۔ اور قضائے معلق وہ ہے جس کے متعلق خود اللہ تعالیٰ کا ہی یہ فیصلہ ہے کہ اگر بندے نے مجھ سے درخواست کی اور میرے آگے دستِ طلب دراز کیا تو میں اسے تبدیل کر دونگا۔ خود قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ ادعونی استجب لکم۔ مجھ سے مانگو میں تمہاری پکار کو سنتا ہوں۔

ظاہر ہے کہ اللہ تعالےٰ کے کچھ فیصلے ایسے ہیں جو بندے کی دعا سے بدلے جا سکتے ہیں۔ اسی لئے تو بندوں کو اس طرف رغبت دلائی گئی ہے۔

اس پر کسی صاحب نے پوچھا کہ "اگر دعاؤں کے بعد اللہ تعالےٰ اپنے فیصلے بدل دیتا ہے تو اسکا مطلب یہ ہے کہ جس وقت وہ فیصلے لکھ رہا تھا (نعوذ باللہ) اسے معلوم نہ تھا کہ متعلقہ شخص دعا مانگے گا یا نہیں؟" اس کے جواب میں ارشاد ہوا۔

فیصلے میں اس نے یہ لکھا تھا کہ اگر یہ شخص دعا مانگے گا تو میں اپنا فیصلہ بدل دوں گا۔ اگر نہیں مانگے گا تو اسے برقرار رکھوں گا۔ میں پہلی حدیث ہی میں اس بات کی وضاحت کر چکا ہوں۔

معلوم ہوتا ہے کہ اسکے بعد کسی نے ان سے یہ نہیں پوچھا کہ خدا کو تو قیامت تک کے آنے والے واقعات کا علم ہوتا ہے اسلئے اسے فیصلے میں یہ کیوں لکھنا پڑا کہ اگر یہ شخص دعا مانگیگا تو میں اپنا فیصلہ بدل دونگا۔ اگر نہیں مانگے گا تو اسے برقرار رکھوں گا۔ کیا اسے اس وقت (معاذ اللہ) اس کا علم نہیں تھا کہ یہ شخص دعا مانگے گا یا نہیں۔

ہم نے اسلئے کہا ہے کہ "معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد کسی نے ان سے یہ سوال نہیں پوچھا"، کہ اگر کسی نے یہ سوال پوچھ لیا ہوتا تو اس وقت تک اسکے خلاف ایک احتجاجی پکٹی بیٹھ چکی ہوتی، یہ فیصلہ دینے کے لئے کہ اس شخص کے عقائد خلافِ اسلام ہیں اور اسکے ساتھ ہی اقبال پر بھی کفر کا فتویٰ لگ چکا ہوتا جس نے کہا تھا کہ ؎

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے

اور یہ تفسیر ہے قرآن کریم کی ان آیات کی جن میں کہا گیا ہے کہ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللّٰهِ (۱۰/۶۴) خدا کے فیصلوں (قوانین) میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا۔ (۳۳/۶۲)۔ تو خدا کی روش میں کبھی تبدیلی

نہیں پائیگا۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ۔ (۱۳/۱۱) جس قسم کی تبدیلی کوئی قوم اپنے اندر پیدا کر لیتی ہے اسی قسم کا خدا کا قانون اس پر نافذ ہو جاتا ہے۔

رمز باریکش بحرفے مضمر است ۔۔۔ تو اگر دیگر شوی اُو دیگر است

خاک شو، نذرِ ہوا سازد ترا ۔۔۔ سنگ شو، بر شیشہ اندازد ترا

شبنمی؟ افتندگی تقدیر تست ۔۔۔ قلزمی؟ پائندگی تقدیر تست ۔۔۔ (اقبالؒ)

اسلئے دعا خدا کے فیصلے بدلوانے کا نام نہیں ۔۔ اسکے فیصلے اٹل ہوتے ہیں۔ دعا اپنے اندر تبدیلی پیدا کرنے کی شدت آرزو کا نام ہے تاکہ اسکے مطابق خدا کا فیصلہ (قانونِ خداوندی) اس پر لاحق ہو۔ اسلئے کہا گیا ہے کہ

تری دعا ہے کہ ہو آرزو تری پوری ۔۔۔ مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے ۔۔۔ (اقبالؒ)

لیکن یہ حقائق ان حضرات کی سمجھ میں کیسے آسکتے ہیں؟ ۔۔ سوزِ دلِ پروانہ مگس را ندہند۔ کہاں قرآن کی بلندیاں، کہاں ان کے ذہن کی پستیاں!

مکتب و ملّا و اسرارِ کتاب ۔۔۔ کورِ مادرزاد و نورِ آفتاب ۔۔۔ (اقبالؒ)

―――― (۰) ――――

۲۔ "مذہب" کی بیچارگی

امریکی خلا نوردوں کی چاند کو زیرِ قدم لانے کی کامیاب مہم پر "مذہب" کیطرف سے جو ردِ عمل ہوا ہے اسے ہم اپنے ہاں کے اخبارات میں دیکھ چکے ہیں لیکن اس ردِ عمل کا دائرہ ہمارے ہاں کے قدامت پرست طبقہ تک ہی محدود نہیں رہا۔ "مذہب" جہاں بھی ہے وہاں اسی قسم کی اضطرابی کیفیت پیدا ہوئی ہے۔ مثلاً بمبئی (انڈیا) سے شائع ہونے والے روزنامہ "انقلاب" کی ۵ اگست کی اشاعت میں حسبِ ذیل خبر شائع ہوئی ہے۔

بنارس ۴ اگست۔ امریکی خلا بازوں نے جس چاند کو اپنے قدموں تلے روندا ہے وہ چاند نہیں ہے جس کی ہندوستان میں چندرماں کی حیثیت سے پوجا ہوتی ہے۔ یہ خیال سنسکرت کے ایک بڑے پنڈت شری راجیشور شاستری نے ظاہر کیا ہے۔

چاند پر انسان کے قدم پہنچنے اور وہاں امریکی خلا بازوں کی گوشت خوری کے بعد سرینگر میں ایک جوتشی نے نوگرہ پوجا کے سلسلے میں چاند کو پوجا کئے جانیوالے اجرامِ فلکی سے خارج کر دیا تھا۔ نوگرہ میں سیاروں کی گردش اور ان کے اثرات کے لئے پوجا کی جاتی ہے۔

سرینگر کے اس جوتشی کے اقدام پر تبصرہ کرتے ہوئے پنڈت راجیشور شاستری نے کہا کہ مقدس شاستروں

ہیں بجائے جس چاند کا نام آیا ہے وہ چاند نہیں ہے جس پر اپالو ۱۱ کے ورخلاباز اترے تھے۔ شاستروں میں جس چندرماں کا ذکر ہے وہ سورج سے بھی آگے ہے۔

پنڈت راجیشور شاستری نے بھی اس خیال سے اتفاق کیا کہ اجرامِ فلکی میں سے کسی سیارے کی پاکیزگی اور تقدس کو انسانی قدم رکھ کر برباد نہیں کرنا چاہیئے۔

"مذہب" نام ہی توہم پرستی کی تاریکیوں میں کھلنے والی چشمِ خفاش (چمگادڑ) کا ہے جو روشنی کی ہر کرن پر پھڑ پھڑا اٹھتا ہے۔ یہ تو خدا کا دین ہے جو قرآن میں محفوظ ہے، جسے سائنس کے کسی انکشاف سے خوف زدہ ہونے کی ذرّا ضرورت نہیں۔ اسلئے کہ وہ علمِ انسانی کے ساتھ ہی نہیں چلتا بلکہ اسکی امامت کرتا ہے۔ اسی ایک سوال (تسخیرِ ارض و سماء) کے متعلق جو کچھ قرآن کریم نے کہا اور جو کچھ "مذہب" نے کہا اسے ایکدوسرے کے سامنے رکھیئے۔ صاف نظر آجائیگا کہ دین اُس خدا کی طرف سے عطا کردہ علم پر مبنی ہے جو علیم و خبیر اور سمیع و بصیر ہے اور "مذہب" کسی ایک دور کے انسانی ذہن کی تخلیق ہے جو اگلے ہی دور میں پیچھے رہ جاتا ہے۔

(۰)

۳۔ اَب اور جب

"اگر تحریکِ پاکستان کے آغاز میں یہ نہ کہا جاتا کہ پاکستان اسلامی شریعت کے نفاذ اور اسلامی نظامِ زندگی قائم کرنے کے لئے بنانا مطلوب ہے تو اس تحریک کو کبھی مسلمانوں کی تائید حاصل نہ ہوتی اور نہ ہی یہ ملک وجود میں آتا۔"

یہ الفاظ ہیں سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے جو ایشیا (لاہور) کی ۲۰ اگست کی اشاعت میں شائع ہوئے ہیں۔ اگر تحریکِ پاکستان کا آغاز ۱۹۳۰ء سے نہ بھی سمجھا جائے جب علامہ اقبالؒ نے پاکستان کا تصور عطا کیا تھا، تو اس کا آغاز ۱۹۳۷ء سے تو یقیناً سمجھا جانا چاہیئے جب قائدِ اعظمؒ اس تصور کو عملاً متشکل کرنے کے لئے میدان میں آئے تھے۔ اس طرح مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق کم از کم ۱۹۳۷ء میں یہ حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ پاکستان اسلامی شریعت کے نفاذ اور اسلامی نظام کے قیام کے لئے بنانا مطلوب ہے۔

لیکن انہی مودودی صاحب نے ۱۹۴۱ء میں لکھا تھا کہ

مسلم لیگ کے کسی ریزولیوشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آجتک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمحِ نظر پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنا ہے۔

(ترجمان القرآن، بابت محرم ۱۳۶۰ھ مطابق مارچ ۱۹۴۱ء)

(باقی ص ۵۶ پر ملاحظہ ہو)

طلوعِ اسلام کالج

(ایک حسین خواب کی سہانی تعبیر)

طلوعِ اسلام کالج کی تعمیر کے سلسلے میں ہمیں ملک کے مختلف گوشوں سے نہایت حوصلہ افزا خطوط موصول ہو رہے ہیں جن میں کہا جاتا ہے کہ یہ اُن کی دیرینہ آرزوؤں کی برومندی کا ذریعہ ہے۔ ہم ان خطوط میں سے صرف ایک خط درج ذیل کرتے ہیں۔ صاحبِ مکتوب ایک روشن دماغ اور حساس قلب کے پیکرِ اخلاص ہیں۔ ہم نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کالج کے سلسلہ میں جو کچھ اب تک ہو چکا ہے اس کی تفصیل اکتوبر میں منعقد ہونے والی طلوعِ اسلام کنونشن میں پیش کی جائیگی جو بعد میں ماہنامہ طلوعِ اسلام میں بھی شائع ہو جائے گی۔

(شیخ سراج الحق، سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی)

(مکتوبِ گرامی)

مکرمی خلیل صاحب! السلام علیکم۔ طلوعِ اسلام کے اگست ۱۹۶۹ء کے پرچے میں شیخ سراج الحق صاحب کا مضمون بعنوان "طلوعِ اسلام کالج" پڑھ کر دلی مسرت ہوئی اور برسوں کے بعد ایک خوش کن کرن کی جھلک نظر آئی۔ میرا یہ عقیدہ عمر بھر رہا ہے، در اصل میری حیثیت ہی کیا ہے، دنیا کے چوٹی کے مدبّروں کی یہی رائے ہے کہ اگر کسی شخص کو اپنی قوم کی بہبود کا خیال ہے تو لازمی امر ہے کہ وہ اپنے وقت کے بچوں اور آئندہ آنیوالی نسلوں کی تربیت و تعلیم کی طرف دھیان دے۔ سچ پوچھئے تو میں ذاتی طور پر تربیت کو تعلیم پر ترجیح دیتا ہوں اور اسی لئے آپ نے بھی تربیت کا ذکر پہلے کیا ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اکثر قومیں مٹ گئیں یا برباد ہو گئیں، چند ایک قومیں علم سے کم بہرہ ہوتے ہوئے اپنی محدود زندگی اور اپنے بھی محدود تجربے کی ایسی مثالیں رکھتی ہیں جن پر یہ مصرعہ صادق آتا ہے۔

(۲) اپنی تعلیم کے زمانے سے ایک تمنا کو دل میں پالا تھا کہ اگر قدرت نے کبھی ہمت دی اور سازگار حالات پیدا کر دیئے تو مقام مادھو پور دریائے راوی کے کنارے ایک ایسی تعلیمی درسگاہ قائم کروں گا جہاں قوم کے بچے دنیاوی آلائشوں سے دور رہ کر اسلامی فضا میں تعلیم حاصل کریں اور تربیت پائیں۔ مادھو پور ضلع گورداسپور میں وہ مقام ہے جہاں دریائے راوی کھلے میدان میں پہاڑوں سے نکل کر آتا ہے اور جہاں سے نہر اپر باری دوآب نکلتی ہے۔ مگر اس خواہش کا پورا ہونا تو درکنار سر دست تو وہ مقام ہی شجرِ ممنوعہ بن گیا ہے۔ اسی دوران ایک مردِ خود آگاہ نے میرے لئے یہ تجویز کیا کہ میں ملازمت ترک کر کے جامعہ ازہر میں عربی زبان اور فقہ اسلامی کی تعلیم حاصل کروں تاکہ اُنکی زیرِ نگرانی فقہ اسلامی پر ایک مبسوط اور مستند کتاب لکھوں جو تمام دنیائے اسلام کے لئے مشعلِ راہ کا کام دے۔ چنانچہ اس مردِ خدا نے اس ضمن میں مصر کی حکومت سے کچھ خط و کتابت بھی کی مگر افسوس کہ اسکی اپنی زندگی نے وفا نہ کی اور یہ دوسرا خواب بھی خواب ہی رہا۔

(۳) آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایک ایسی درسگاہ کے قیام کی تجویز کی خوشخبری دینا جو میری خوابوں کی تعبیر تصور ہو سکتی ہو میرے لئے کس قدر خوش آئند ہو سکتی ہے۔ دعا کرتا ہوں کہ خدائے بزرگ و برتر آپکی جماعت کی اس خواہش کو بار آور کرے تاکہ قوم کے نونہال اس نعمت سے تشنہ نہ رہیں جو قدرت نے انکو ودیعت کیا تھا۔ یہ خبر پڑھتے ہی دل میں گدگدی ہوئی کہ اس کام میں آپکا ہاتھ کسی معقول نہج سے بٹاؤں مگر سر دست حالات ایسے نہیں کہ زیادہ مدد کر سکوں۔ بہرحال فی الحال انشاء اللہ جولائی ۱۹۷۰ء میں ایک کمرہ کی تعمیر کا خرچ جس کا تخمینہ آپ نے مبلغ بیس ہزار روپے لگایا ہے پیش کر سکوں گا۔

والسلام!

ادارہ طلوع اسلام　کی　مایۂ ناز پیشکش

جہانِ فردا

پرویز صاحب نے سلسلۂ معارف القرآن کا آغاز آج سے تیس سال پہلے کیا۔ اس وقت تک اس سلسلہ کی حسب ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ من و یزداں۔ ابلیس و آدم۔ جوئے نور۔ برقِ طور۔ شعلۂ مستور۔ معراجِ انسانیت۔ اسلام کیا ہے۔ اس سلسلہ کی آخری کڑی مرنے کے بعد کی زندگی سے متعلق تھی جس کا ایک عرصے سے انتظار تھا۔ للہ الحمد کہ وہ انتظار کی گھڑیاں ختم ہو گئیں۔

اُخروی زندگی سے متعلق ان کی کتاب

جہانِ فردا

پریس میں جا چکی ہے اور آئندہ کنونشن تک تیار ہو جائے گی ....———— اس میں

موت۔ قبر۔ برزخ۔ حشر۔ نشر۔ جنّت۔ دوزخ

وغیرہ موضوعات پر قرآنی حقائق پیش کئے گئے ہیں۔ کتاب کی اہمیت اس کے موضوع اور شمولات سے ظاہر ہے۔ اور پھر اس سے بھی کہ یہ کتاب اس موضوع پر مفکرِ قرآن کے عمر بھر کے غور و فکر کا نچوڑ ہے!

کتاب دو ایڈیشنوں میں شائع کی جا رہی ہے۔ قسم اول۔ سفید کاغذ۔ عمدہ جلد اور حسین گرد پوش۔ قیمت دس روپے ۱۰/-
قسم دوم۔ نیوز پرنٹ کاغذ۔ بکس بورڈ کور۔ قیمت چھ روپے ۶/- (علاوہ محصولڈاک)

فرمائش بھیجتے وقت اس کی تصریح کر دی جائے کہ کونسی قسم مطلوب ہے۔

ملنے کا پتہ

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵/ بی۔ گلبرگ لاہور

رنگینیٔ خونِ شہداء

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت، نہ کشور کشائی

ہر ویز صاحب کا خصوصی درسِ قرآن کریم جو ۷ ستمبر ۱۹۷۹ء کی صبح بیادِ شہدائے پاکستان دیا گیا

عزیزانِ گرامی قدر ۔ سلام و رحمت!

جب کسی قوم کا دورِ انحطاط شروع ہوتا ہے، اس کے دل میں آفاق گیری کے ولولے سرد پڑ جاتے ہیں۔ اس کے کوہ شکن بازو شل ہو جاتے ہیں۔ اس کے حوصلے افسردہ اور عزائم پژمردہ ہو جاتے ہیں۔ نہ اس کے سامنے زندگی کا کوئی بلند مقصد رہتا ہے اور نہ اس مقصد کے لئے جینے کی تڑپ۔ تو اس کے نزدیک تصورِ حیات اس سے زیادہ کچھ نہیں رہتا کہ

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یونہی تمام ہوتی ہے

یعنی (اقبالؒ کے الفاظ میں) اس کا دین، نفس گدازی کے بجائے نفس شماری رہ جاتا ہے۔ زندگی اس کے نزدیک عبارت ہوتی ہے اختلافِ لیل و نہار کے میکانکی عمل۔ نہ اس کی صبح، کسی تازہ آرزو کی درخشندہ کرن اپنے جلو میں لاتی ہے اور نہ ہی اس کی شام اس کے لئے قربِ منزل کا نشانِ حیات افروز بنتی ہے یہی وہ قوم ہے جس کے متعلق حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ من استوی یوماہ فھو مغبون۔ جس قوم کے دو دن ایک جیسے گذر جائیں، یعنی اس کا آج گذشتہ کل کے مقابلہ میں زیادہ کامیاب

نہ ہو، وہ تباہ ہو گئی۔ اسی حقیقت کو اقبال نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

اگر امروزِ تو تصویرِ دوش است
بخاکِ تو شرارِ زندگی نیست

چنانچہ یہ قوم اپنی لاش کو اپنے کندھے پر لئے لئے پھرتی ہے اور پھر ایک دن، اپنے جنازے کی آپ امام بن کر، اپنے ہاتھوں لحد میں اتر جاتی ہے اور دھرتی خوش ہو جاتی ہے کہ اس کے سینے پر سے ایک اور بوجھ اترا۔

لیکن جب کسی قوم کے دل میں زندہ رہنے کی آرزو بیدار ہوتی ہے تو وہ بلند مقاصد کی حیاتِ تازہ کے ہم رکاب، رواں دواں جانبِ منزل بڑھتی چلی جاتی ہے، اور جو موانع اس کی راہ میں سنگِ گراں بن کر حائل ہوتے ہیں انہیں خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتی ہے۔ یہی وہ قومیں ہیں جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ

نشاں یہی ہیں زمانے میں زندہ قوموں کے
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں

ان قوموں کے زندگی کے دن، اختلافِ لیل و نہار کی گردش دولابی سے عبارت نہیں ہوتے۔ انہیں خالقِ لیل و نہار اور فاطر ارض و سما، ایام اللہ — یعنی خود اللہ کے دن کہہ کر پکارتا ہے۔ اور ہر اس داعیِ انقلاب سے جو باطل کی قوتوں سے ٹکر لینا چاہتا ہے، تاکیداً کہتا ہے کہ وَذَكِّرْهُمْ بِأَيَّامِ اللَّهِ (۱۴/۵) ان کے دل میں، ایام اللہ کی یاد تازہ کراؤ۔ انہی ایام اللہ میں ایک یوم وہ تھا جس کی یاد، صاحبِ ضربِ کلیم، حضرت موسیٰ نے اپنی قوم کو یہ کہہ کر دلائی تھی کہ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ أَنجَاكُم مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ (۱۴/۶) خدا کے اس گراں بہا انعام کو یاد کرو جب اس نے تمہیں فرعون جیسے پیکرِ استبداد کے دستِ تظلم سے نجات دلائی تھی۔

اسی قسم کا ایک یوم اللہ ہے جس کی یاد تازہ کرنے کے لئے برادرانِ عزیز! ہم آج یہاں جمع ہوئے ہیں — کیسا حیات افروز تھا وہ دن، اور کس قدر روح پرور اور ولولہ انگیز ہے اس کی یاد!

ایام اللہ کی تیاری

لیکن یہ ایام اللہ، عزیزانِ من! یونہی اچانک نہیں آجاتے۔ یہ ایک بڑے طول طویل، نہایت صبر آزما اور ہمت طلب، پروگرام کا نقطۂ آخریں ہوتے ہیں جسے قرآن نے جہاد کہہ کر پکارا ہے۔ جہاد کے معنی ہیں اپنے مقصد کے حصول کے لئے جہدِ مسلسل۔ سعیٔ پیہم، عمل متواتر، غیر منقطع کوشش۔ ان تھک محنت۔ اس میں ہر صبح، ایک نئے سنگ راہ کو سامنے لاتی، اور ہر شام، جوئے شیر کے قریب تر ہو جانے کی نوید جانفزا کانوں تک پہنچاتی ہے۔ یہی وہ پروگرام ہے جس میں یہ حقیقت، ایک عملِ محسوس کی شکل میں سامنے آجاتی ہے کہ

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے حامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر! رازِ دوامِ زندگی

یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآنِ کریم نے، مجاہدین کے مقابل میں، قاعدین کا لفظ لاکر، اس جامعیت سے واضح اور نمایاں کیا ہے کہ جوں جوں نگہ بصیرت اس پر غور کرتی ہے، انسان وجد میں آجاتا ہے۔ فرمایا: لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَ الْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَ أَنْفُسِهِمْ۔ مومنین میں سے، بلا کسی عذر و تکلیف کے، بیٹھے رہنے والے اور اپنے مال و دولت اور جان سے مصروفِ جہاد رہنے والے، کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ وَ أَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِينَ دَرَجَةً۔ خدا نے قاعدین کے مقابلہ میں مجاہدین کے مدارج بلند کئے ہیں۔ وَ كُلًّا وَعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنَىٰ۔ اس میں شبہ نہیں کہ صحیح قرآنی معاشرہ کے قیام کے بعد زندگی کی جو خوشگواریاں نصیب ہونگی، ان سے سب متمتع ہونگے۔ لیکن یہ حقیقت اپنے مقام پر رہے گی کہ وَ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِينَ عَلَى الْقَاعِدِينَ أَجْرًا عَظِيمًا۔ (۴/۹۵) خدا نے، مجاہدین کو قاعدین پر بہت بڑی فضیلت عطا فرمائی ہے۔ ان کی جد و جہد اور سعی و کاوش کا اجر عظیم ہے۔ دَرَجَاتٍ مِنْهُ۔ خدا کے ہاں بلندیٔ مدارج۔ وَ مَغْفِرَةً وَ رَحْمَةً۔ سامانِ حفاظت و رحمت کی فراوانیاں ــــ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُورًا رَحِيمًا۔ (۴/۹۶)۔ یہ اس خدا کا وعدہ ہے جو غفور بھی ہے اور رحیم بھی۔

جہاد اور قتال میں فرق

ہمارے ہاں عام طور پر جہاد سے مراد دشمنوں کے خلاف جنگ لی جاتی ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے ابھی ابھی عرض کیا ہے، جہاد مسلسل تگ و تازِ حیات کا نام ہے۔ اور یہ عمل ساری زندگی پیہم اور متواتر جاری رہتا ہے۔ اسی تگ و تاز میں ایک مقام ایسا بھی آجاتا ہے جہاں دشمن کے خلاف جنگ کرنا بھی ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اسے قتال کہا جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جہاد ہر مقام پر قتال نہیں۔ البتہ قتال، جہاد کی آخری کڑی ہے۔ مومن کا مقصدِ زندگی، دنیا میں امن قائم رکھنا ہے۔ خود خدا کا ایک نام اَلْمُؤْمِنُ ہے جس کے معنی ہیں، امن کی ضمانت دینے والا۔ لہٰذا، جماعتِ مومنین کا فریضہ، امن عالم کا قیام ہے۔ اور جہاد کے معنی ہیں، دنیا میں امن قائم کرنے کے لئے مسلسل کوشش۔ واضح رہے کہ محض امن قائم رکھنا، اسلام کا منتہائے نگاہ نہیں۔ اس کا مقصود فلاح و بہبودِ آدمیت اور ارتقائے ذاتِ انسانیہ ہے اور چونکہ یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا جب تک دنیا میں امن قائم نہ ہو۔ اس لئے قیامِ امن، مومن کے فرائض میں داخل ہو جاتا ہے۔ میں نے

جیسا کہ ابھی ابھی بتایا ہے، خدا کی ایک صفت المؤمن ہے. یعنی امنِ عالم کا ضامن. لیکن انسانی دنیا میں خدا کی اس قسم کی صفات کا ظہور انسانوں کے ہاتھوں سے ہوتا ہے. اس لئے دنیا میں ایک ایسی جماعت (قوم) کا وجود ضروری ہے جو سرکش قوتوں کی مدافعت کرے. اسی لئے کہا کہ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ - (۲/۲۵۱). اگر خدا، انسانوں کی ایک جماعت کے ہاتھوں سرکش قوتوں کی مدافعت کا سامان بہم نہ پہنچاتے تو زمین میں فساد ہی فساد برپا ہو جاتے. مدافعت کے اس سامان یا قوت کو، تلوار کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے. سورۂ حدید میں ہے. لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَ الْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ. ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل دے کر بھیجا. ان کے ساتھ ضابطۂ قوانین نازل کیا. میزانِ عدل قائم کی تاکہ لوگ اپنے معاملات انصاف کے ساتھ طے کریں. وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْہِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ - (۵۷/۲۵). دلائل و براہین. ضابطۂ قوانین. نظامِ عدل ان لوگوں کے لئے کافی ہوتا ہے جن کے دل میں قانون کا احترام ہو. لیکن جو لوگ عدل و انصاف پر چلنا ہی نہ چاہیں اور دھاندلی سے اپنی بات منوانا چاہیں، تو ان کے لئے ہم نے آہنی شمشیر نازل کی ہے. اس میں بڑی صلابت اور سختی ہوتی ہے. لیکن اس کی یہی سختی اگر قانون کے احترام کو قائم رکھنے کے لئے صرف کی جائے، تو وہ نوعِ انسانی کے لئے بڑی منفعت بخش ثابت ہوتی ہے. اس کے بغیر، نہ عدل قائم رہ سکتا ہے نہ امن. اقبال نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ

سوچا بھی ہے اے مردِ مسلمان کبھی تو نے
کیا چیز ہے فولاد کی شمشیرِ جگر دار
اس بیت کا یہ مصرعۂ اول ہے کہ جس میں
پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار

صدرِ اوّل کی تاریخ

ہمارے صدرِ اول کی تاریخ، جماعتِ مومن کے اسی فریضۂ قیامِ امن و مدافعت بالسیف کی درخشندہ شہادت ہے. نبی اکرمؐ اور آپؐ کے رفقائے کرامؓ کی تیرہ سالہ مکی زندگی، دلائل و براہین کے ذریعے قیامِ امن و ثبتِ میزانِ عدل کی سعی مسلسل سے عبارت ہے. لیکن جب واقعات نے ثابت کر دیا کہ وہ لوگ، نہ خود آئین و ضوابط کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے تیار ہیں اور نہ ہی انہیں قانون اور آئین کے مطابق معاشرہ قائم کرنے کی اجازت دیتے ہیں، تو یہ نہایت پُر امن طریق سے اُس مقام کی طرف منتقل ہو آئے جہاں کی فضا آئینِ خداوندی کے مطابق

زندگی بسر کرنے کے لئے زیادہ مساعد تھی۔ لیکن قریش کی سرکش قوتوں نے یہاں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا، اور ابھی یہ مہاجرین اپنے نئے مساکن میں اطمینان سے بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ وہ ایک لشکر جرار لے کر مدینہ پر حملہ آور ہو گئے۔ اب وہ مقام آگیا تھا جس کے لئے، دلائل و براہین اور نظامِ عدل و آئین کی مدافعت کے لئے شمشیر خارہ شگاف نازل کی گئی تھی۔ یہ وہ مقام ہے جہاں اس جماعت کو، دشمن کے مقابلہ میں جنگ کرنے کی اجازت دی گئی۔ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا۔ یہ لوگ کہ جن پر پہلے سخت مظالم کئے گئے۔ اور جب یہ اُس سرزمین کو چھوڑ کر، اتنی دور چلے آئے، تو مستبد قوتیں یہاں بھی ان پر چڑھ دوڑیں۔ انہیں اب اجازت دی جاتی ہے کہ یہ تلوار سے ان کی مدافعت کریں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں نہایت ظلم و تعدی سے ان کے گھروں سے نکال باہر کر دیا گیا ــــ کس جرم کی پاداش میں؟ صرف اس جرم کی کہ یہ کہتے تھے کہ ــ رَبُّنَا اللّٰهُ۔ ہمارا رب اللہ ہے۔ (۲۲/۴۰-۳۹)۔ انہیں جنگ کی اجازت دی گئی اور کہا گیا کہ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ۔ (۸/۳۹) تم ان مخالفین سے جنگ کرو اور اس وقت تک جنگ جاری رکھو جب تک وہ فتنہ جو انہوں نے کھڑا کر رکھا ہے، پوری طرح فرو نہ ہو جائے۔ یعنی جب تک دین پورے کا پورا، اللہ کے لئے نہ ہو جائے۔

دین کا اللہ کے لئے ہونا

قرآنِ کریم کی اس آیت (اور اسی قسم کی دیگر آیات) کا صحیح مفہوم سامنے نہ ہونے سے ایک بڑی غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ اس سے یہ (غلط مفہوم) لیا جاتا ہے کہ اُس وقت تک جنگ جاری رکھو جب تک تمام کفار مسلمان نہ ہو جائیں یہ مفہوم قرآن کی اس بنیادی تعلیم کے خلاف ہے جس میں کہا گیا ہے کہ لَآ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ۔ (۲/۲۵۶) دین کے معاملہ میں کسی قسم کا جبر و اکراہ نہیں۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ قرآن کریم نے جہاں جماعتِ مؤمنین کو پہلی مرتبہ جنگ کی اجازت دی ہے (اور جس آیت کا پہلا حصہ میں پہلے پیش کر چکا ہوں اس میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا۔ (۲۲/۴۰)۔ اگر خدا سرکش قوتوں کی روک تھام کا انتظام دوسری جماعتوں کے ہاتھوں نہ کراتے، تو راہبوں کی خانقاہیں، عیسائیوں کے گرجے۔ یہودیوں کے معبد اور مسلمانوں کی مسجدیں، سب منہدم کر دی جاتیں۔ یعنی مسلمانوں کا فریضہ یہ ہے کہ وہ غیر مذاہب کے معبدوں کی حفاظت، اپنی جان دے کر کریں۔ اس لئے وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ۔ کے معنی یہ ہیں کہ تم سرکش قوتوں کے خلاف جنگ کرو تاآنکہ ایسی فضا پیدا ہو جائے جس میں ہر شخص کو مذہبی آزادی حاصل ہو۔ دین کا معاملہ، انسانوں کے فیصلہ کرنے کا نہ ہو بلکہ بندے اور خدا کا معاملہ

بن جائے۔ یہی وجہ ہے کہ وَ یَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ۔ کے بعد کہا کہ فَاِنِ انْتَھَوْا۔ فَاِنَّ اللّٰہَ بِمَا یَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ۔ (۸/۳۹)۔ لیکن اگر یہ لوگ اپنی سرکشی اور دھاندلی سے باز آجائیں تو پھر تم ان کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھاؤ۔ پھر خدا اس پر نگاہ رکھیگا کہ یہ آئندہ کیا کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر وَ یَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ کے معنی یہ ہوتے کہ "جنگ کئے جاؤ تاآنکہ یہ سب مسلمان ہو جائیں" تو اسکے بعد کا ٹکڑا بے معنی ہو جاتا۔

ہماری یہاں کی تاریخ

بہرحال، یہ تھا ہمارے صدر اول کی تاریخ کا متعلقہ حصہ۔ اور یہی وہ تاریخ تھی جس نے اپنے آپ کو تیرہ سو سال بعد ہندوستان میں دہرایا۔ ہندوستان میں انگریزی عملداری میں ہمیں "دین" کی آزادی حاصل نہیں تھی۔ جب انگریز نے وہاں سے چلے جانے کا ارادہ کیا اور اہل ہند کے سامنے آزادی کی صبح نمودار ہونے کو آئی، تو ہم نے محسوس کیا کہ انگریز کے چلے جانے کے بعد جس قسم کی بساط وہاں بچھائی جا رہی تھی، اس کی رُو سے ہمیں دین کی آزادی قطعاً حاصل نہیں ہوگی۔ اس مقام پر عزیزانِ گرامی قدر! ایک اہم نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔ اُس زمانے میں ہندوستان میں ایک گروہ موجود تھا ـــ اور اس حقیقت کے احساس و اظہار سے ہماری آنکھیں زمین میں گڑ جاتی ہیں کہ یہ گروہ (THE SO. CALLED) "علمائے کرام" پر مشتمل تھا۔ جو کہتا تھا کہ انگریز کے چلے جانے کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ ہندو ضمانت دیتا ہے کہ مسلمانوں کو نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ۔ صدقات۔ فطرانہ کی پوری پوری آزادی ہوگی۔ اس لئے اس باب میں ہمیں کوئی وجہ شکایت نہیں ہونی چاہیئے۔ کس قدر مقامِ تاسف ہے کہ یہ حضرات جو دین کا علم رکھنے کے مدعی ہی نہیں بلکہ اپنے آپ کو اس کا اجارہ دار سمجھتے تھے، اتنا بھی نہیں سمجھتے تھے ـــ اور اگر سمجھتے تھے تو اسلام اور ملت سے انتہائی غداری کرتے تھے ـــ کہ اسلام "مذہب نہیں" دین ہے۔ اور دین کے معنی ہیں وہ نظام جس میں امت، زندگی کے تمام شعبوں میں، قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کر سکے۔ نماز، روزہ، حج۔ زکوٰۃ کی آزادی، مذہبی آزادی کہلا سکتی ہے۔ دین کی آزادی نہیں۔ دین کی آزادی، صرف مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت میں ممکن ہے جہاں وہ خدا کے قوانین کو (جو قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں) عملاً نافذ کر سکیں۔ یہی وہ حقیقت تھی جسے علامہ اقبالؒ نے ان جامع الفاظ میں بیان کیا کہ

ملا کو جو ہے ہند میں سجدہ کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

یہی وہ حقیقت ہے جسے قائداعظمؒ نے ۱۹۴۷ء میں حیدرآباد (دکن) میں اس سوال کے جواب میں واضح کیا تھا کہ جس جداگانہ حکومت کا آپ مطالبہ کرتے ہیں، وہ اس حکومت سے کن معانی میں مختلف ہوگی جو ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اشتراک سے وجود میں آئے گی۔ قائداعظمؒ نے فرمایا تھا۔ (اور یہ وہ الفاظ ہیں جنہیں صدبار دہرایا جاچکا ہے اور جنہیں ہزار ہا بار دہرانے کی ضرورت ہے) کہ:۔

> اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں، قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے لامحالہ آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہوتی ہے۔

حیرت ہے کہ ہمارے علماء کرام، تو اسلامی مملکت کے اس امتیاز کو نہیں سمجھتے تھے لیکن ہندو اسے خوب سمجھتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۴۱ء میں لدھیانہ میں اکھنڈ بھارت کانفرنس کے صدر مسٹر منشی نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا تھا کہ

> پاکستان کے مطالبہ سے مقصد یہ ہے کہ مسلمان اپنے لئے ایسے مساکن (HOME - LANDS) بنائیں جہاں زندگی اور طرز حکومت قرآنی اصولوں کے سانچے میں ڈھل سکے مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ پاکستان ایک ایسا خطۂ ارض ہوگا جس میں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔

اور اس کے بعد اس نے کہا تھا کہ

> ہندو قوم خواہ کتنی ہی بزدل اور غیر منظم کیوں نہ ہو، وہ اسے کبھی برداشت نہیں کر سکتی کہ مسلمان ایسی حکومت قائم کریں۔

ہماری پُرامن جدوجہد

ہم نے وہاں، دس سال تک (مکی زندگی کی طرح) نہایت پُرامن طریق سے، ہندو کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ ہماری، دین کی آزادی کے راستے میں مزاحم نہ ہو، لیکن اس نے (قریش کی طرح) ایک نہ مانی اور اپنی مخالفت میں آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ تا آنکہ ۱۹۴۷ء میں فیصلہ ہو گیا کہ ہم ہندوستان سے الگ ہٹ کر، اپنی مملکت جداگانہ

قائم کرلیں۔ یہ گویا ہماری "ہجرت" تھی۔ اس پر معاملہ ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن ہندو کا جذبۂ اسلام دشمنی معاملہ کو ختم کیسے ہونے دیتا۔ آئینی طور پر وہ تقسیم ملک پر مجبور ہو گیا لیکن قلبی طور پر بدستور دانت پیستا رہا۔ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند کا آئینی فیصلہ ہوا، اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے، جو اس فیصلہ میں ایک اہم فریق کی حیثیت رکھتی تھی، ۱۴ جون کو یہ ریزولیوشن پاس کیا کہ

> آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو پورا پورا یقین ہے کہ جب موجودہ جذبات کی شدت میں کمی آ جائے گی تو ہندوستان کے مسئلہ کا حل صحیح پس منظر میں دریافت کر لیا جائے گا۔ اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے دو الگ الگ قومیں ہونے کا باطل نظریہ مردود قرار پا جائے گا۔

پنڈت جواہر لعل نہرو، ایک طرف تقسیم ہند کی دستاویز پر دستخط کر رہا تھا اور دوسری طرف اپنی قوم سے کہہ رہا تھا کہ

> ہماری سکیم یہ ہے کہ ہم اس وقت جناح کو پاکستان بنا لینے دیں۔ اور اس کے بعد، معاشی طور پر، اور دیگر انداز سے، ایسے حالات پیدا کرتے جائیں جن سے مجبور ہو کر مسلمان گھٹنوں کے بل جھک کر ہم سے درخواست کرے کہ ہمیں پھر سے ہندوستان میں مدغم کر لیجئے۔

اس مقصد کے حصول کے لئے وہاں کیا کیا سکیمیں سوچی جاتی رہیں، اس کا اندازہ راجہ مہندر پرتاب کے اس اعلان سے ہو سکتا ہے جو اس نے ۱۹۵۰ء میں کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ

> جب تک پاکستان کا وجود ختم نہیں ہو جاتا ہمارا ملک کوئی ترقی نہیں کر سکتا۔ حالات اس طرح بدل رہے ہیں کہ مجھے یقین ہوتا چلا جا رہا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں جنگ ناگزیر ہو گئی ہے۔ بنابریں، میں حکومت ہند کو مشورہ دوں گا کہ وہ افغانستان کو اپنے ساتھ ملا کر پاکستان کو ختم کر دے۔

جنگ ستمبر چنانچہ، اس کے بعد ہندوستان نے اندر ہی اندر، پاکستان پر حملہ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ لیکن ان کے اندرونی حالات نے اجازت نہ دی، تا آنکہ انہوں نے، ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح، بلا کسی قسم کے اعلانِ جنگ کئے، اپنی پوری قوت کے ساتھ، پاکستان پر چاروں طرف سے حملہ کر دیا۔ یہ وہی مقام تھا جہاں مدینہ کے مسلمانوں کو پہلے پہل جنگ کرنے کی اجازت ملی تھی — اور واقعات کی مماثلت بھی ایسی تھی کہ نقشہ بالکل بدر کے میدان کا سامنے آ رہا تھا — وہی گھر بار سے نکالے ہوئے مسلمانوں

کے خلاف طوفان انگیز یورش، وہی تعداد کی قلت، وہی سامان اور اسلحہ جنگ کی کمی۔ وہی ملک کی بے سروسامانی ــــ لیکن اس سب کمی کو پورا کرنے والا ــــ ہماری افواج کے مایہ ناز جیالوں کے دل میں وہی ولولۂ جہاد اور وہی جان دے کر حیاتِ جاوید حاصل کرنے کا جذبۂ بے اختیار شوق!

یہ مماثلت ایک قدم اور بھی آگے بڑھتی تھی۔ جنگ کے زمانے میں دشمن کی وساوس انگیز ایجنسیوں کی طرف سے یہ بات بھی فضا میں پھیلائی گئی تھی کہ پاکستان اسلامی مملکت نہیں۔ اسلئے، اس کی طرف سے یہ جنگ، جہاد نہیں کہلا سکتی۔ نہ ہی اس میں مرنے والے شہید قرار پا سکتے ہیں۔ اگر بات اسلامی مملکت کے متشکل ہو جانے کی ہے، تو جنگِ بدر کے وقت، خود مدینہ میں بھی (ان معنوں میں) اسلامی مملکت وجود میں نہیں آئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود، بدر کی جنگ بلند ترین جہاد تھی اور اس میں جان دینے والے مرتبۂ شہادت پر فائز۔ یہ اس لئے کہ مدینہ کی سرزمین، اسلامی مملکت کے قیام کے لئے منتخب کی گئی تھی۔ اسلئے اس کی حفاظت، عین اسلام کی حفاظت، اور دین کا اولین تقاضا تھی۔ پاکستان میں بھی اس وقت اسلامی مملکت قائم نہیں ہوئی تھی (نہ اب تک قائم ہوئی ہے)۔ لیکن یہ خطۂ زمین حاصل ہی اسلئے کیا گیا ہے کہ یہاں اسلامی مملکت قائم کی جائے۔ اس لئے اس خطۂ زمین کی حفاظت، ہمارا دینی فریضہ ہے۔ لہٰذا اس کی حفاظت کے لئے جنگ، جہاد اور اس میں جان دینا شہادت۔ جیسا کہ میں اکثر بطور مثال کہا کرتا ہوں، جو خطۂ اراضی مسجد کی تعمیر کے لئے مخصوص کر دیا جائے کیا اسکی حفاظت اسی طرح دینی فریضہ نہیں ہو جاتا جس طرح خود مسجد کی حفاظت؟ اگر (خدانخواستہ) پاکستان کی سرزمین محفوظ نہ رہے ــــ دشمن کے قبضہ میں چلی جائے ــــ تو اسلامی مملکت قائم کس طرح کی جا سکے گی؟ لہٰذا جنگِ ستمبر عین جہاد تھا۔ اور اگر اب بھی (خدانخواستہ) پھر دشمن کی طرف سے ایسا اقدام ہو، تو اسکی مدافعت عین جہاد ہو گی!

جہاد کی عظمت

اور جب جہاد کا اعلان ہو جائے تو پھر عام دنیاوی کام تو ایک طرف، بڑی سے بڑی (اور نیکی بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ

أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ ..... أَجْرٌ عَظِيمٌ ۔ (۹/۱۹-۲۲)

کیا تم سمجھتے ہو کہ حاجیوں کے لئے پانی کی سبیلیں لگا دینے، اور خانہ کعبہ کی آباد کاری کے مختلف کام سرانجام دے دینے سے انسان اس شخص کے برابر ہو جاتا ہے جو قوانینِ خداوندی اور حیاتِ اُخروی پر ایمان رکھے اور خدا کی راہ میں جہاد کرے۔ (تم اپنے ذہن میں کچھ ہی کیوں نہ سمجھ لو) میزانِ خداوندی میں یہ کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ ایسا

سمجھنا، حقائق کو ان کے صحیح مقام سے ہٹا دینا ہے۔ لہٰذا، جو ایسا کریگا اسے خدا کبھی کامیابی کی راہ نہیں دکھائیگا۔

یاد رکھو — جو لوگ خدا کے متعین کردہ نصب العین حیات کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں اور اس نصب العین کے حصول کی خاطر اپنا سب کچھ چھوڑ دیتے ہیں اور اپنی جان اور مال سے مصروفِ جہاد رہتے ہیں، یہی لوگ ہیں جن کے مدارج، خدا کے ہاں، بہت بلند ہیں۔ یہی لوگ کامیاب اور فائز المرام ہوں گے۔ ان کا نشو و نما دینے والا اس بات کی خوشخبری دیتا ہے کہ رحمتِ خداوندی کا سحاب کرم ان پر گہر باری کرے گا۔ ان کے اعمال، خوشگوار نتائج سے ہم آہنگ ہونگے۔ ان کے لئے سدا بہار جنت کی نعمتیں ہونگی۔ ان کا اجر عظیم ہوگا۔

مجاہدین کے بلند مقام

مجاہدین کی تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ (قرآنِ کریم کی تصریح کے مطابق) "یہ لوگ جنگ میں بھوک اور پیاس کی جس مصیبت کو جھیلتے ہیں۔ جو تکان اور مشقت یہ اٹھاتے ہیں ان کا ہر وہ قدم جو اس مقام پر پڑتا ہے جہاں اس کا پڑنا دشمن کے لئے غیظ و غضب کا موجب بنتا ہے حتیٰ کہ ہر وہ نقصان جو انہیں دشمن کی طرف سے پہنچتا ہے ان میں سے ہر چیز ان کے لئے حسنِ عمل بنتی چلی جاتی ہے۔ اسلئے کہ خدا کا قانونِ مکافات کسی کے حسنِ عمل کو ضائع نہیں کرتا۔ اسی طرح یہ لوگ اس مقصد کے لئے جو کچھ بھی خرچ کریں — وہ تھوڑا ہو یا بہت۔ یا جو منزل بھی وہ قطع کریں۔ یہ سب کتابِ خداوندی میں درج ہوتے چلے جاتے ہیں تاکہ خدا ان کا بہترین صلہ عطا فرمائے۔" (۹/۱۲۰-۱۲۱)

یہ تھی اُن مجاہدین کی عظمت جو دشمن کی کثرتِ تعداد اور فراوانیٔ اسلحہ و سامانِ جنگ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے، اس خطۂ پاک کی حفاظت، اور ہم سب کی جان۔ مال۔ عزت۔ آبرو۔ عصمت کی صیانت کے لئے، آنِ واحد میں، سیسہ پلائی ہوئی دیوار کیطرح دشمن کے مقابلہ کے لئے جا کھڑے ہوئے، اور سترہ دن تک اس عزم و ہمت اور جاں سپاری و سرفروشی کے مظاہرے کئے جنہیں ہم صدرِ اول کی تاریخوں میں تو پڑھتے تھے لیکن جن کی عملی مثالیں کبھی دیکھنے میں نہ آئی تھیں۔ یہی تھے وہ اپنا سب کچھ خدا کی راہ میں قربان کر دینے، اور اس کا کوئی صلہ انسانوں سے نہ مانگنے والے، جن کے جوشِ عمل اور حسنِ کردار کو دیکھ کر خود خدا نے یہ کہہ کر ان پر تحسین و آفرین کے پھول برسائے تھے کہ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ۔ اُو میرے بہادر سپاہیو! دشمن کو تم قتل نہیں کر رہے تھے۔ ہم خود ایسا کر رہے تھے۔ وَ مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى۔ (۸/۱۷) تیرے شک تمہاری کمانوں سے تیر

رہے تھے لیکن انہیں حیلا ہم رہے تھے ۔۔۔ مجاہدین کی تیرافگنی اور شمشیرزنی کے علاوہ اور کسی کا کوئی بڑے سے بڑا کارنامہ بھی ایسا نہیں جسے خود خدا نے اپنی طرف منسوب کیا ہو۔ کیا حسن عمل کا اس سے بلند تر درجہ کوئی اور بھی ہو سکتا ہے ؟ یہ صرف مرد مجاہد ہی کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ

ہاتھ ہے اللہ کا، بندۂ مومن کا ہاتھ !

محیر العقول کارنامے

ان سترہ دنوں میں ہماری بری۔ بحری اور فضائی افواج نے کس قدر محیر العقول کارنامے سرانجام دیئے، اس کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ باہر کی دنیا تو ایک طرف، خود اہل پاکستان، جن کی آنکھوں کے سامنے یہ سب کچھ ہو رہا تھا، باور ہی نہیں کرتے تھے کہ اس قسم کے نادر الوقوع کارنامے انسان سرانجام دے سکتے ہیں۔ یہ وجہ تھی کہ ان کارناموں کے لئے انہوں نے کہیں سفید گھوڑوں والوں کو پردۂ غیب سے باہر نکالا اور کہیں سبز جامے والوں کو آسمان سے اتارا اور اس طرح اپنے تحیر کی تسکین کے لئے افسانوں کی پناہ گاہیں تراشیں۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ ہم نے کبھی اس حقیقت کا مشاہدہ ہی نہیں کیا تھا کہ

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پر روح الامیں پیدا

گذشتہ چار برس میں ان واقعات میں سے اکثر و بیشتر کی تفاصیل ہمارے سامنے آچکی ہیں اور ابھی ان کا سلسلہ جاری ہے ۔۔۔ مجھے افسوس ہے کہ اس فقید المثال جنگ کی کوئی مفصل تاریخ ابھی تک مرتب نہیں ہوئی ۔۔۔ یا کم از کم شائع نہیں ہوئی۔ اگر اس قسم کی تاریخ شائع ہوتی تو اس میں ہم دیکھتے کہ ہمارے ان سرفروشوں نے اُن چند دنوں میں کیا کچھ کر دکھایا تھا۔ میں نے خود ان تحیر انگیز کارناموں میں سے چند ایک کو اپنے خطابات میں دہرایا اور مقالات میں لکھا ہے۔ آج اتنا وقت نہیں کہ میں ان تفاصیل کو پھر آپ کے سامنے لاؤں۔ اس کے لئے ایک وجہ معذرت یہ بھی ہے کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ ان میں سے چند ایک جانثاروں کے کارناموں کی یاد تازہ کرادی جائے اور باقیوں کو چھوڑ دیا جائے۔ ان کی تو کیفیت یہ ہے کہ ان میں سے جس واقعہ پر بھی نگاہ ڈالی جائے ۔۔۔ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست ۔۔۔ میں اس وقت (یوں کہئے کہ تبرکاً) صرف دو ایک ایسے واقعات کو دہرانا چاہتا ہوں جن کی یاد میرے شعور (یا شاید لاشعور) کے افق سے ابھر کر سامنے آگئی ہے۔

عزیزانِ من ! یہ حقیقت ہے کہ زندگی جہاں بھی ہے وہ اپنا تحفظ چاہتی ہے۔ حفاظتِ خویش (PRESERVATION OF SELF) زندگی کا بنیادی تقاضا (BASIC INSTINCT)

ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ سپاہی جب میدانِ جنگ میں جاتا ہے تو وہ ہر وقت موت کو اپنے سامنے دیکھتا ہے۔ لیکن جان دے دینے کی آرزو کے باوجود، اگر ایسا ممکن ہو کہ وہ اپنے مقصد میں بھی کامیاب ہو جائے اور اسکی جان بھی بچ جائے، تو فطرت کے جبلی تقاضا کے ماتحت وہ چاہے گا کہ اسکی جان بچ جائے۔ لیکن اس جنگ میں ایسے بے شمار واقعات سامنے آئے جہاں ایک طرف آبرو مندانہ طور پر جان بچا لینے کا امکان تھا اور دوسری طرف جان دیکر دشمن کا کچھ نقصان کر دینا ـــ تو ہمارے ان جذبہ قربانی سے سرشار جیالوں نے دشمن کو نقصان پہنچانے کے مقابلہ میں اپنی جان بچانے کی فکر نہیں کی۔ میں اس سلسلہ میں صرف ایک واقعہ پیش کرتا ہوں۔ جسے ٹینک رجمنٹ کے ایک لانس نائیک نے بیان کیا تھا۔ اس نے کہا کہ لڑائی کا تیسرا دن تھا۔ معرکہ ایسا گھمسان کا کہ قریب تریب جنگ دست بدست تک نوبت پہنچ گئی تھی۔ میرا ٹینک ہٹ ہو گیا تو میں نے ایک مشین گن سنبھال لی۔ لیکن دشمن اتنا قریب تھا کہ اس نے ہینڈ گرینیڈ پھینکنے شروع کر دیئے۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ اپنی فوج کا ایک سپاہی میرے قریب آ کر لیٹ گیا اور کہنے لگا کہ وقت بہت نازک ہے۔ دشمن کے ہینڈ گرینیڈ تمہارے قریب آ کر پھٹ رہے ہیں۔ تم اپنا کام کرتے جاؤ۔ اگر کوئی گرینیڈ تمہارے بالکل قریب آ کر گرا تو اسے میں لے لوں گا۔ لانس نائیک نے بتایا کہ میں سمجھ گیا کہ اس نے جو کہا ہے کہ "گرینیڈ کو میں لے لوں گا" اس سے اس کا مطلب کیا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ تم پاگل ہو رہے ہو، تم اپنی جان بچاؤ۔ میری فکر نہ کرو۔ اس نے کہا کہ گرامیں! بات میری اور تمہاری حفاظت کی نہیں۔ میرے پاس صرف رائفل ہے، تمہارے پاس مشین گن ہے۔ اس وقت زیادہ ضرورت مشین گن کی ہے۔ میں مارا گیا تو صرف ایک رائفل خاموش ہو گی۔ اور اگر تم مارے گئے تو مشین گن بے کار ہو کر رہ جائیگی اس لئے .. ..

وہ اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ ایک گرینیڈ میرے قریب آ کر گرا۔ وہ سپاہی بجلی کے کوندے کی طرح لپکا اور دفعتاً اس گرینیڈ کے اوپر جا گرا۔ اس کے گرتے ہی گرینیڈ پھٹا اور اس کے ساتھ ہی اسکی بوٹیاں فضا میں اڑ گئیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ ادھر یہ ہوا اور ادھر ہمارے سپاہیوں نے دشمن کا منہ پھیر دیا اسلئے اسکے بعد کوئی اور گرینیڈ ادھر نہ آیا۔

وہ لانس نائیک یہ واقعہ سنا رہا تھا اور اسکی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ اس نے کہا کہ مجھے نہ اس جاں نثار کا نام معلوم ہے نہ اسکی پلٹن کا کوئی اتا پتہ۔ اگر مجھے کم از کم اسکے گاؤں ہی کا پتہ مل جاتا تو میں اسکی ماں کے پاس جاتا، اسکے قدموں پر سر رکھ کر اسے مبارکباد دیتا اور اسے کہتا کہ

دھن بادہیں ایسی مائیں جو اس قسم کے سپوت جنتی ہیں!

یہ تو تھی میدانِ جنگ میں ایک سپاہی کے جذبۂ خود فراموشی کی عدیم النظیر مثال۔ دوسری طرف میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس جنگ میں ہماری قوم کی بیٹیوں نے جس کردار کا ثبوت دیا اس سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آگئی کہ ہماری خاکستر میں ہنوز ایسی چنگاریاں موجود ہیں جو وقت آنے پر شعلۂ جوالہ بن سکتی ہیں۔ اس سلسلہ میں اس ایک واقعہ کو سنیئے اور غور سے سنیئے۔

میدانِ جنگ میں ایک سپاہی کے ہاتھ کو دیکھا گیا تو اس میں تازہ مہندی رچی ہوئی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی ابھی ابھی شادی ہوئی ہے۔ دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ میری شادی میں دو دن باقی تھے کہ جنگ میں جانے کے لئے بلاوا آگیا۔ میں رخصت ہونے لگا تو میری ماں اور بہن نے شگن پورا کرنے کے لئے میرے ہاتھ میں مہندی لگا دی۔ میری منگیتر اپنے ہی گھرانے کی لڑکی تھی۔ وہ خاموشی سے گھونگھٹ بڑھائے قدم اٹھائے، میرے قریب آئی اور اپنی چھنگلی کے خون کے دو قطرے میری مہندی میں ٹپکا کر خاموشی سے واپس چلی گئی۔ جب میں گھر سے باہر نکلا تو کسی عورت کی آواز سنائی دی ــــ "پیچھے کی فکر نہ کرنا۔ یہ وقت کبھی کبھی آتا ہے" ــــ معلوم نہیں یہ آواز میری ماں کی تھی، بہن کی یا منگیتر کی۔ لیکن اس آواز میں کچھ ایسا جادو کا اثر تھا کہ بھرپور بازی جیت لینے یا سر دینے کے سوا، مجھے کسی اور بات کا ہوش ہی نہیں رہا۔

اور دوسرا واقعہ ہے کھیم کرن کے محاذ کا کہ جب ایک پلٹن کے سپاہی ایک گاؤں کے قریب سے گذرے تو کچھ جوان لڑکیوں نے ان سپاہیوں پر اپنے دوپٹے پھینکے اور کہا کہ "ویرو! بھیناں دیاں اینہاں چنیاں دی لاج رکھنا" (بھائیو! اپنی بہنوں کے ان دوپٹوں کی لاج رکھنا)۔ پلٹن کے حوالدار نے بتایا کہ معلوم نہیں ان دوپٹوں میں کیا تاثیر تھی کہ اسکے بعد ہمیں اس کا ہوش نہیں رہا کہ ہمارا مقابلہ ٹینکوں سے ہے یا توپوں سے۔ یہ دوپٹے ہماری کمر سے بندھے رہے تھے اور ان بیٹیوں کے ننگے سر ہماری آنکھوں کے سامنے پھر رہے تھے۔ جب تک ہم نے ان دوپٹوں کو کھیم کرن سے آگے نہیں پہنچا دیا، ہم نے دم نہیں لیا۔ اس مہم میں میری پلٹن کے دو سپاہی شہید ہو گئے۔ جب میں ان کی لاشوں کے پاس گیا تو میں نے دیکھا کہ انہوں نے ان دوپٹوں کو اپنی ٹوپیوں کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔

یہ واقعہ، گاؤں کی چند بچیوں کے جذبۂ حمیت انگیزی اور سپاہیوں کے ولولہ آمیز ردِ عمل تک محدود نہیں۔ یہ ایک بڑی عظیم اور عمیق حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ اور وہ حقیقت یہ ہے کہ جس قسم کے (بظاہر) ناقابلِ تسلیم، تحیر انگیز کارنامے ہمارے نوجوانوں نے سرانجام دیئے، وہ صرف وہ قوم سرانجام دے سکتی ہے جو آبرو کی قیمت کا صحیح احساس رکھتی ہو۔ اور آبرو کے احساس کی کیفیت یہ ہے کہ جو قوم اپنی بیٹیوں اور

بہنوں کی آبرو کا احترام کرے، اس کے نزدیک دنیا کی ہر عورت کی آبرو یکساں طور پر واجب الاحترام اور قابلِ حفاظت ہو جاتی ہے۔ ہماری افواج کے نوجوانوں نے جو اپنی بیٹیوں اور بہنوں کی عصمت و آبرو کی حفاظت کے لئے جانیں دیں تو اس کا فطری نتیجہ یہ تھا کہ ان کے ہاتھوں، دشمن کی عورتوں کی عزت و آبرو بھی اسی طرح محفوظ رہی۔ اور یہ وہ حقیقت تھی جس کی شہادت خود دشمن کو بھی دینی پڑی۔ آپ کو یاد ہوگا، جنگ کے بعد، بھارت کے وزیرِ دفاع، چوان نے، پارلیمان کے بھرے اجلاس میں اعلان کیا تھا کہ

> اس سترہ روزہ جنگ میں کوئی ایسا واقعہ بھی ہمارے نوٹس میں نہیں آیا جس میں پاکستانی فوج کے کسی فرد نے ہماری کسی عورت کو میلی نظروں سے بھی دیکھا ہو۔

میدانِ جنگ میں شجاعت و بسالت کے کارناموں کی مثالیں، اور جگہ بھی مل جائیں گی لیکن اس قسم کی بلندیٔ کردار اور پاکیزگیٔ سیرت کی جو مثال ہمارے نوجوانوں نے قائم کی، اس کی نظیر شاید ہی کسی اور قوم کے ہاں مل سکے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس جنگ میں فتح و کامرانی ہمارے لئے باعثِ صد افتخار ہے۔ لیکن میرے نزدیک، اس فتح و کامرانی سے کہیں زیادہ، وجہ فخر و مباہات، وہ بلندیٔ کردار ہے جس کا ثبوت ہمارے ان نوجوانوں نے اس طرح پیش کیا اور جس کی وجہ سے ہم دنیا میں سر اٹھا کر چلنے کے قابل ہو گئے۔ خدا کی ہزار ہزار رحمت ہو ان پاکباز روحوں پر جنہوں نے ہمیں اقوامِ عالم کی نگاہوں میں اس قدر باعزت و باوقار بنا دیا۔

(۶)

جنگ ختم نہیں ہوگئی

لیکن عزیزانِ من! ان سترہ دنوں کی کامیابی کے بعد بھارت کے ساتھ ہماری جنگ ختم نہیں ہوگئی۔ نہ یہ ختم ہو سکتی ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جنگ کے بعد، جب صلح کی گفت و شنید ہو رہی تھی تو ہندوستان کے وزیرِ دفاع مسٹر چوان نے ایک بیان میں کہا تھا کہ

> پاکستان اور ہندوستان کے درمیان اسی دن سے مخاصمت کی بنیاد رکھ دی گئی تھی جس دن پاکستان وجود میں آیا تھا۔ بھارت اور پاکستان کے درمیان آئیڈیالوجی کا اختلاف ہے۔ اس کے سوا کوئی اختلاف نہیں۔ اور یہ اختلاف اور دشمنی ہفتے یا مہینے بھر کی نہیں بلکہ سالہا سال تک رہے گی۔ بھارت کو اس کے لئے ایک تازہ اور فیصلہ کن جنگ کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

چوان نے سچ کہا تھا۔ اسلئے کہ ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی!

حق اور باطل کی جنگ نہ کبھی ختم ہوئی ہے، نہ ختم ہوگی۔ لیکن چوان کے اس اعلان کے بعد باطل تو مستقبل کی

جنگ کی تیاریوں میں پہلے سے بھی زیادہ جذب و انہماک اور جوش و خروش سے مصروف ہو گیا اور اس کے مقابلہ میں ہم نے کیا کیا' اور کیا کر رہے ہیں ؟ جہاں تک فوجی تیاریوں کا تعلق ہے' ہمیں یقین ہے کہ حکومت اس کی طرف سے نہ غافل رہی ہے' نہ اب غافل ہے۔ لیکن جنگ عزیزانِ من! صرف فوج ہی تو نہیں لڑتی۔ ملک کی مسلح آبادی' اس میں' زیادہ نہیں تو برابر کی شریک ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم نے اس چار سال میں' آنے والے خطرات کے مقابلہ کے لئے کیا کیا ہے ؟ آپ کہیئے کہ ہم کر ہی کیا سکتے تھے جو ہم نے کچھ نہیں کیا۔ اس میں شک نہیں کہ ہم نہ تو ٹینک چلانا سیکھ سکتے تھے نہ ہوائی جہاز اڑانا۔ لیکن ہم وہ کچھ کر سکتے تھے جو نہ توپوں کے گولے کر سکتے ہیں' نہ ہوائی جہازوں کے بم۔ ہم اپنے اندر وہ کیریکٹر پیدا کر سکتے تھے جس پر جنگ اور امن دونوں زمانوں میں' قوموں کی فتح و کامرانی کا دار و مدار ہوتا ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ ہم نے اپنے اندر کیریکٹر پیدا کرنے کے بجائے' کیا کیا ؟ اسے سمجھنے کے لئے' میں آپ کو ایک بار پھر صدرِ اول کی تاریخ کی طرف لے جانا چاہتا ہوں۔ ہمیں دیکھا کہ بدر کی جنگ میں' تعداد کی قلت اور سامانِ حرب و ضرب کی کمی کے باوجود' جماعتِ مومنین کو اس قدر عظیم فتح نصیب ہوئی کہ دشمن کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ ہو کیسے گیا! لیکن اس سے اگلے ہی سال' اسی دشمن سے اُحد کے مقام پر ٹکراؤ ہوا۔ اور پہلے ہی ہلّہ میں اسے میدان چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ لیکن اس کے بعد ایک ایسا واقعہ ظہور میں آیا کہ وہ فتح شکست میں بدل گئی اور مسلمانوں کو سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ وہ واقعہ کیا تھا جس کا نتیجہ اس قدر نقصان رساں نکلا ؟ صرف یہ کہ تیر اندازوں کا ایک دستہ' اپنے مقام کو چھوڑ کر' مالِ غنیمت پر لپک پڑا۔ وہ لوٹ میں لگ گیا۔

اب آپ سوچیے کہ جب پوری فوج کے صرف ایک دستے کے لوٹ میں لگ جانے سے' فتح مبدل بہ شکست ہو سکتی ہے' تو جہاں ساری کی ساری قوم لوٹ میں مصروف ہو جائے' وہاں حالت کیا ہو جائے گی۔ بدقسمتی سے ہماری ساری قوم لوٹ میں مصروف ہو چکی ہے۔ اس نے صرف اُن سترہ دنوں میں لوٹ سے ہاتھ روکا تھا تو ملک کی فضا بدل گئی تھی۔ توقع یہ تھی کہ اس کے بعد یہ بات قوم کی سمجھ میں آ جائے گی کہ جس قوم کی حالت یہ ہو کہ اس کا ایک طبقہ لوٹنے میں مصروف ہو اور دوسرا طبقہ ان لوٹنے والوں کے ہاتھوں میں بے بس اور مقہور، وہ قوم کسی خطرہ کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہا کرتی۔ ہربرٹ کے الفاظ ہیں۔

> وہ نظامِ تہذیب جس میں حق و صداقت کو عادی طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہو' آخر الامر تباہ ہو کر رہتا ہے۔ ناانصافی سے کوئی فرد کیسا ہی کامیاب کیوں نہ ہوتا چلا جائے' وہ اجتماعی نظام جس کا وہ جزو ہے اور وہ جماعت جو اس ناانصافی کے مالِ غنیمت سے نفع اندوز ہوتی ہے' اس ناانصافی کی وجہ سے انجامِ کار برباد ہو جاتی ہے۔ انتخابِ طبیعی کے اٹل قانون کی بنا پر

گناہ کی اُجرت موت ہے۔

(THE MAKING OF HUMANITY . P. 262)

یہ وجہ ہے کہ لوٹ اور سلب و نہب میں مصروف، ظلم اور تعدی کی عادی قوم خطرات کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اسکا علاج ؟ صرف جہاد۔ یعنی ظلم اور ناانصافی کی قوتوں کے خلاف مسلسل جدوجہد۔ لاقانونیت کے خلاف متواتر جنگ۔ سلب و نہب (EXPLOITATION) کے خلاف پیہم ستیزہ ہے۔ اسی عمل پیہم اور سعی مسلسل کی آخری کڑی میدانِ جنگ میں دشمن کا مقابلہ ہے۔ جہاد اس پورے پروگرام (PROCESS) کا نام ہے جسکی اہمیت کے متعلق قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ .. .. وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ۔ (۹/۲۴)

(اے رسول! ان سے کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ، بیٹے، بھائی، بیویاں اور دیگر اہل خاندان، اور مال و دولت جو تم کماتے ہو اور وہ تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے تم ڈرتے ہو۔ اور وہ مکانات جنہیں تم اس قدر پسند کرتے ہو، اگر ان میں سے کوئی چیز بھی تمہیں، خدا اور اسکے رسول اور اسکی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ عزیز ہوگی تو پھر تم انتظار کرو تا آنکہ خدا کا فیصلہ تمہارے سامنے آجائے۔ اسے اچھی طرح سمجھ رکھو کہ خدا اس قوم کو کبھی کامرانیوں کی راہ نہیں دکھاتا جو صحیح راستہ کو چھوڑ کر ادھر اُدھر نکل جاتے۔

"خدا کا وہ فیصلہ" جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے کیا ہے؟ اسے بگوشِ ہوش سن لیجئے۔ کہا کہ اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا۔ (۹/۳۹) اگر تم اس مقصدِ عظیم کے حصول کیلئے باہر نہیں نکلو گے تو اس کا نتیجہ بڑا الم انگیز ہوگا۔ یعنی خدا تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئیگا اور تم اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکو گے۔

یہ انجام ہوتا ہے اس قوم کا جو جہاد سے منہ موڑتی ہے۔

حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

اور اسے بھی سن رکھیے، کہ جب قوموں کی اجتماعی تباہی ہوتی ہے تو وہ — قرآن کے الفاظ میں — لَا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً (۸/۲۵) انہی لوگوں تک محدود نہیں رہا کرتی جنہوں نے ظلم اور ناانصافی کی ہو۔ اسکے شعلے ساری کی ساری قوم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس قسم کی تباہی سے محفوظ رکھے اور اس مقام پر پہنچکر جہادِ پاکستان کے مجاہدین اور شہداء کی عظمت و رفعت پھر ابھر کر ہمارے سامنے آجاتی ہے جنکے مقدس خون کے صدقے ہم اس قسم کی ہمہ گیر تباہی سے محفوظ رہے تھے۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن ÷ خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

والسلام!

—————— (پرویز) ——————

شاہد عادل

جماعتِ اسلامی
اور
اسلامی طریقۂ انتخاب

جماعتِ اسلامی کی طرف سے اسلام کی جو نت نئی تاویلات ہوتی رہتی ہیں وہ ناظرین کی نظروں سے گزرتی رہتی ہیں۔ یہ حضرات ایک ہی چیز کو کبھی تو اسلامی قرار دے دیتے ہیں اور جب وہی چیز ان کے مفید مطلب نہیں رہتی تو اسے جھٹ سے غیر اسلامی قرار دے کر رد کر دیا جاتا ہے۔ اور اس کی جگہ اس چیز کو اسلامی کہہ کر پیش کر دیا جاتا ہے جو کل تک غیر اسلامی ٹھیرائی جاتی تھی۔ طریقۂ انتخاب کے متعلق بھی انہوں نے یہی طرزِ عمل اختیار کر رکھا ہے۔ اور اسی کی ایک جھلک دکھانا اس مقالہ کا مقصود ہے۔

مغربی جمہوریت اور قیامِ پاکستان

تحریکِ پاکستان میں چونکہ قوم کی معتدبہ اکثریت قائداعظمؒ کے پرچم تلے جمع تھی اور جماعتِ اسلامی کی الگ مسجد (ضرار) صرف ڈیڑھ اینٹ پر مشتمل تھی، اس لئے انہوں نے وہاں جمہوریت (یعنی اکثریت) کو خلافِ اسلام قرار دینے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد، ابتداءً بھی ان کی یہی حالت تھی۔ اس لئے جمہوریت بدستور مردود و مطرود تھی۔ اس کے بعد انہوں نے رفتہ رفتہ "مسلمانوں کی اس کافرانہ مملکت" میں اپنے قدم جمانے شروع کئے۔ اقتدار کی کرسیوں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگے تو جمہوریت کے متعلق بھی انکے "اسلام" نے چولا بدلنا شروع کیا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے سب سے پہلے ایک الگ طریقِ انتخاب تجویز کیا جسے اسلامی پنچایتی نظام کا نام دیا گیا۔ اس طرح ان حضرات نے، جو قیامِ پاکستان کے لئے انتخاب میں حصہ لینا تو کجا ووٹ ڈالنا بھی حرام سمجھتے تھے، انتخاب میں حصہ لیا۔ لیکن قوم ان "صالحین" کو اچھی طرح پہچانتی تھی اس لئے جماعت کی طرف سے انتخابات کے لئے کھڑے کئے ہوئے ۳۰ نمائندوں میں

سے صرف ایک صالح نمائندہ بمشکل کامیاب ہوسکا۔

اس کے بعد صدر ایوب کی حکومت نے (خوش قسمتی یا بدقسمتی سے) ملک میں وہی طریقِ انتخاب رائج کردیا جسے جماعتِ اسلامی نے عین مطابق اسلام قرار دیا تھا۔ تو اسی جماعت نے اس طریق کو یکسر خلاف اسلام ٹھہرا دیا۔ اور وہی طریقِ انتخاب جسے کل تک غیر اسلامی قرار دیا جاتا تھا، اسے عین مطابق اسلام بتا کر آگے بڑھانا شروع کردیا۔ اربابِ حکومت محوِ حیرت تھے کہ یہ کیا ماجرا ہے کہ

ہم ہوئے کافر تو وہ کافر مسلماں ہوگیا

لیکن انہیں کیا معلوم تھا کہ یہاں کفر و اسلام کا معیار خدا کے متعین فرمودہ غیر متبدل اصول نہیں، ان حضرات کی مصلحتیں ہیں۔

مغربی طرزِ جمہوریت اور اس کا طریقۂ انتخاب

یہ تو تھا اجمال۔ اب اس کی تفصیل ملاحظہ ہو۔ مغربی جمہوریت کی برائیاں اجاگر کرنے اور اسے انسانیت کے لئے ایک لعنت ثابت کرنے کے لئے امیرِ جماعتِ اسلامی نے جو زورِ قلم صرف کیا تھا اگر وہ تمام مواد جمع کردیا جائے تو ایک ضخیم کتاب بن جائے۔ لیکن ہمارے مدِنظر چونکہ اختصار ہے اس لئے ہم صرف چند ایک اہم اقتباسات پر اکتفا کریں گے۔ مغربی طرزِ جمہوریت کے متعلق فرماتے ہیں۔

> یہ مغرب کی نام نہاد ڈیموکریسی جس کے متعلق یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس میں عمومی حاکمیت ہوتی ہے اس کا ذرا تجزیہ کرکے دیکھئے۔ جن لوگوں سے مل کر کوئی اسٹیٹ بنتا ہے، وہ سب کے سب نہ تو خود قانون بناتے ہیں اور نہ خود اس کو نافذ کرتے ہیں۔ انہیں اپنی حاکمیت چند مخصوص لوگوں کے سپرد کرنی پڑتی ہے تاکہ ان کی طرف سے وہ قانون بنائیں اور اسے نافذ کریں۔ اس غرض سے **انتخاب کا ایک نظام** مقرر کیا جاتا ہے لیکن اس انتخاب میں زیادہ تر وہ لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو عوام کو اپنی دولت، اپنے علم، اپنی چالاکی اور اپنے جھوٹے پراپیگنڈے کے زور سے بے وقوف بنا سکتے ہیں۔ پھر یہ خود عوام کے ووٹ ہی سے ان کے الٰہ بن جاتے ہیں۔ عوام کے فائدے کے لئے نہیں بلکہ اپنے شخصی اور طبقاتی فائدے کے لئے قوانین بناتے ہیں۔ اور اسی طاقت سے جو عوام نے ان کو دی ہے ان کو عوام پر نافذ کرتے ہیں۔ یہی مصیبت امریکہ میں ہے، یہی انگلستان میں ہے اور یہی ان سب ممالک میں ہے جن کو جمہوریت کی جنت ہونے کا دعوےٰ ہے۔

(اسلام کا نظریہ سیاسی۔ طبع دہم۔ صفحہ ۲۷)

جمہوریت کی مخالفت کے پردے میں قیام پاکستان کی مخالفت

جیسا کہ ہم کہہ آئے ہیں جماعت اسلامی کی طرف سے جمہوریت کی مخالفت کا مقصد وحید قیام پاکستان کی مخالفت تھی۔ اسلئے اس موضوع پر ان کی جتنی بھی نگارشات ہیں اس میں نظریۂ پاکستان کی مخالفت کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ پہلے دیکھئے کہ جو لوگ نظریۂ پاکستان پر ایمان رکھتے تھے، امیر جماعت اسلامی ان کو کون سا خطاب عنایت کرتے ہیں۔ اس سے یہ حقیقت بھی واضح

نظریۂ پاکستان پر ایمان رکھنے والے جنت الحمقاء میں رہتے ہیں

ہو جائے گی کہ آجکل عامۃ الناس کو فریب دینے کے لئے جو یہ حضرات بار بار نظریۂ پاکستان کا نام لے رہے ہیں تو اس وقت یہ اس کی کس طرح مخالفت کرنے بیٹھے فرماتے ہیں:۔

"جنت الحمقاء میں رہنے والے لوگ اپنے خوابوں میں خواہ کتنے ہی سبز باغ دیکھ رہے ہوں لیکن آزاد پاکستان (اگر فی الواقع وہ بنا بھی) لازماً جمہوری لادینی اسٹیٹ کے نظریہ پر بنے گا جس میں غیر مسلم اسی طرح برابر کے شریک ہونگے جس طرح مسلمان۔ اور پاکستان میں ان کی تعداد اتنی کم اور ان کی نمائندگی کی طاقت اتنی کمزور نہ ہوگی کہ شریعت اسلامی کو حکومت کا قانون اور قرآن کو اس جمہوری نظام کا دستور بنایا جا سکے؛

ماہنامہ ترجمان القرآن۔ بابت فروری ۱۹۴۶ء صفحہ ۱۵۴، ۱۵۵)

نظریۂ پاکستان پر نظر رکھنا اسلام سے انحراف کی راہ ہے

نظریۂ پاکستان پر ایمان رکھنے والوں کو جنت الحمقاء کا مکین بنانے کے بعد اپنی ایک مشہور کتاب "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصہ سوم میں، ایک عنوان "اسلام کی راہ راست اور اس سے انحراف کی راہیں" کے تحت یہ گل افشانی فرماتے ہیں کہ سرے سے نظریۂ پاکستان ہی اسلام سے انحراف ہے۔ بہتر ہوگا کہ انہی کی زبانی سنیئے:۔

مسلمانوں میں سے جو لوگ پاکستان کے نصب العین پر اپنی نظر جمائے ہوئے ہیں اور جو انگریزی حکومت سے ہندوستان کی آزادی پر اپنی تمام امیدوں کا انحصار رکھتے ہیں اور جو ان دونوں کے درمیان مختلف راہیں تلاش کر رہے ہیں ان سب کے اندر ایک چیز مجھے مشترک نظر آتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اسلام کے اصلی نصب العین کی طرف براہ راست پیش قدمی کرنے سے یہ سب لوگ جھجکتے ہیں، مشکلات کا ایک بہت بڑا پہاڑ ان کو اس راستے میں حائل نظر آتا ہے۔

اور اس کو دور سے دیکھ کر یہ دائیں یا بائیں مڑ جاتے ہیں۔ تاکہ پھر کے راستوں سے نکل جائیں۔

(مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم صفحہ ۱۵۰)

پاکستان میں دین آثار قدیمہ ہوگا

اپنی اسی کتاب کی دوسری جلد میں ان لوگوں کو جو نظریہ پاکستان کو اسلامی حکومت کے قیام کا واحد ذریعہ سمجھتے تھے یوں خطاب فرماتے ہیں۔

آزادی کے پروانے کو لے کر جو حضرات یہ سمجھ رہے ہیں کہ آئندہ کے قومی جمہوری لادینی اسٹیٹ میں ان کے مذہب اور ان کی تہذیب کا پورا تحفظ ہوگا، انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ تحفظ اسی نوعیت کا تحفظ ہے جیسا کہ پرانی تاریخی عمارتوں کا ہوا کرتا ہے۔

(مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ دوم صفحہ ۱۳۴)

نظریہ پاکستان مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی

نظریہ پاکستان کو عملی جامہ جمہوری طریقہ انتخاب کے ذریعے پہنایا جا رہا تھا۔ اس لئے اس کو بھی خلافِ اسلام ثابت کرنا مودودی صاحب کے فرائض میں شامل تھا۔ فرماتے ہیں۔

جمہوری انتخاب کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے دودھ بلو کر مکھن نکالا جاتا ہے۔ اگر دودھ زہریلا ہو تو اس سے جو مکھن نکلے گا قدرتی بات ہے کہ وہ دودھ سے زیادہ زہریلا ہوگا۔ اسی طرح سوسائٹی اگر بگڑی ہوئی ہو تو اس کے ووٹوں سے وہی لوگ منتخب ہو کر برسر اقتدار آئینگے جو اس سوسائٹی کی خواہشاتِ نفس سے سندِ قبولیت حاصل کر سکیں گے پس جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومت الٰہی قائم ہو جائے گی۔ ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔

(مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم صفحہ ۱۲۵-۱۲۶)

نظریہ پاکستان کیلئے کام کرنیوالے نادان ہیں

اس سے ذرا آگے چل کر فرماتے ہیں کہ جو لوگ قیام پاکستان کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں وہ نادان ہیں۔ یہ گوہر افشانی بھی انہی کی زبانی سنیئے۔

اس سے زیادہ خوفناک حقیقت یہ ہے کہ نام کے مسلمان ہونے کی وجہ سے یہ لوگ کفار کی نسبت بہت زیادہ جسارت اور بے باکی کے ساتھ ایسی ہر کوشش کو کچلیں گے اور ان کے نام اٹھنے کے

ظلم کی پردہ پوشی کے لئے کافی ہونگے۔ جب صورت معاملہ یہ ہے تو کیا وہ شخص نادان نہیں ہے جو اسلامی انقلاب کا نصب العین سامنے رکھ کر ایسی جمہوری حکومت کے قیام کی کوشش کرے جو ہر کافرانہ حکومت سے بڑھ چڑھ کر اس کی مقصد کی راہ میں حائل ہوگی۔

(ایضاً۔ صفحہ ۱۷۶ - ۱۷۷)

اختصار کے پیشِ نظر ہم انہی چند اقتباسات پر اکتفا کرتے ہیں جن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مغربی جمہوریت اور اس کے طریقۂ انتخاب کی مخالفت سے کس طرح نظریۂ پاکستان کی مخالفت کی گئی تھی۔

قیامِ پاکستان کیلئے انتخابات

ان حضرات کی طرف سے نظریۂ پاکستان کی اس قدر سخت مخالفت کے باوجود قائداعظمؒ اسے انگریز اور ہندو سے اصولی طور پر منوانے میں کامیاب ہوگئے۔ اس کے بعد اس نظریئے کے عملاً متشکل ہونے کا دارومدار انتخابات پر تھا جو اس مقصد کے لئے کرائے جا رہے تھے۔ قائداعظمؒ نے مخالفین اور موافقین تمام مسلمانوں سے اسلام کے نام پر یہ اپیل کی کہ اب جبکہ نظریۂ پاکستان ایک حقیقت بن چکا ہے اسلئے کم از کم اسکے حق میں ووٹ تو دیجئے۔ اس وقت جہاں نظریۂ پاکستان کے کئی سخت مخالفین اس کے حق میں ووٹ دینے پر آمادہ ہوگئے، امیرِ جماعتِ اسلامی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے یہ کورا جواب دیا کہ

> ووٹ اور الیکشن کے معاملے میں ہماری پوزیشن کو صاف صاف ذہن نشین کر لیجئے۔ پیش آمدہ انتخابات یا آئندہ آنے والے اسی طرح کے انتخابات کی اہمیت جو کچھ ہو اور ان کا جیسا کچھ بھی اثر ہماری قوم یا ہمارے ملک پر پڑتا ہو بہر حال ایک با اصول جماعت ہونے کی حیثیت سے ہمارے لئے یہ ناممکن ہے کہ کسی وقتی مصلحت کی بنا پر ہم ان اصولوں کی قربانی گوارا کر لیں جن پر ہم ایمان لائے ہیں۔

(رسائل و مسائل۔ حصہ اول صفحہ ۲۲۳ ملخص)

دیکھئے! آجکل نظریۂ پاکستان کے الفاظ کی گردان کرنے والوں نے کس طرح آخری حد تک اس کے قیام کی مخالفت کی۔ اور اس کے حق میں ووٹ تک دینے سے بھی احتراز کیا۔ نظریۂ پاکستان کی اس سے شدید عملی مخالفت اور کیا ہو سکتی تھی!

قیامِ پاکستان اور جماعتِ اسلامی

تاہم ان حضرات کی نظریۂ پاکستان کی اس حد تک مخالفت کے باوجود یہ نظریہ حقیقت بن گیا تو یہ حضرات پہلے ہی قافلے کے ساتھ ہندوستان سے یہاں تشریف لے آئے۔ یہاں آکر دیکھا تو اقتدار کی کرسیاں کچھ

قریب نظر آئیں۔ اسلئے ان پر قبضہ کرنے کو جی للچایا۔ لیکن ان کرسیوں تک راستہ اسی مغربی جمہوریت کے طریقہ انتخاب سے ہوکر جاتا تھا۔ عوام کی عدالت بھی سامنے تھی اور وہ پوچھ سکتے تھے کہ جب آپ حضرات نے اس طریقہ انتخاب کو خلافِ اسلام قرار دیتے ہوئے قیامِ پاکستان کے لئے ووٹ تک نہیں دیئے تھے تو اب اپنے لئے اقتدار کے حصول کے لئے یہ طریق کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ جماعتِ اسلامی کے لئے ایسی صورتِ حالات سے تاویلات کا چکر دے کر آگے نکل جانا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اس نے اسی مغربی جمہوریت کے طریقہ انتخاب کی برائیاں گناتے ہوئے اس میں حصہ بھی لیا اور عوام کو بیوقوف بنانے کے لئے اپنے لئے ایک علیحدہ اسلامی پنچایتی نظام بھی بنا لیا جس میں کسی امیدوار کو براہ راست منتخب کرنے کی بجائے تین چار

جمہوری طریقہ انتخاب کی خرابیاں

واسطوں کے بعد منتخب کیا جاتا تھا۔ اس وقت انہوں نے اپنے "اسلامی طریقہ انتخاب" کو اجاگر کرنے کے لئے مغربی طریقہ انتخاب کی خرابیوں کو یوں نمایاں کیا۔

ہماری تشخیص یہ ہے کہ اس ملک کے سیاسی نظام کی خرابیوں کا بنیادی سبب یہاں کے طریق انتخاب کی خرابی ہے۔ جب انتخاب کا موسم آتا ہے تو منصب و جاہ کے خواہشمند لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور دوڑ دھوپ کرکے یا تو کسی پارٹی کا ٹکٹ حاصل کرتے ہیں یا آزاد امیدوار کی حیثیت سے اپنے لئے کوشش شروع کر دیتے ہیں۔ اس کوشش میں وہ کسی اخلاق اور کسی ضابطے کے پابند نہیں ہوتے۔ کسی جھوٹ، کسی فریب، کسی چال، کسی دباؤ اور کسی ناجائز ہتھکنڈے کے استعمال سے بھی ان کو دریغ نہیں ہوتا۔ اس گندے کھیل کے میدان میں قوم کے شریف عناصر اول تو اترتے ہی نہیں اور بھولے بھٹکے اگر وہ کبھی اتر بھی آتے ہیں تو پہلے ہی قدم پر انہیں میدان چھوڑنا پڑتا ہے۔ مقابلہ صرف ان لوگوں کے درمیان رہ جاتا ہے جنہیں نہ خدا کا خوف ہو نہ خلق کی شرم، اور نہ کوئی بازی کھیل جانے میں باک۔ پھر ان میں کامیاب ہو کر وہ نکلتا ہے جو سب جھوٹوں کو جھوٹ میں اور سب چال بازوں کو چال بازی میں شکست دیدے۔

(ترجمان القرآن جلد ۲۷ عدد ۳، ۴۔ صفحہ ۲۴۳، ۲۴۴ / ۹۶)

ناپاک طریق انتخاب

اس طریقِ انتخاب کی خباثت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اب ہم کو اس امر میں کوئی شک باقی نہیں رہا ہے کہ ہماری اجتماعی زندگی اور قومی سیاست کو جن چیزوں نے سب سے بڑھ کر گندا کیا ہے ان میں سے ایک یہ امیدواری اور پارٹی ٹکٹ کا طریقہ ہے۔ اسی بنا پر جماعتِ اسلامی نے یہ فیصلہ کیا ہے، کہ

اس ناپاک طریق انتخاب کی جڑ کاٹ دیجاتے۔ یہ جماعت نہ اپنے پارٹی ٹکٹ پر آدمی کھڑا کریگی نہ اپنے ارکان کو آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہونے کی اجازت دیگی۔ نہ کسی ایسے شخص کی تائید کرے گی جو خود امیدوار ہو اور اپنے لئے ووٹ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ خواہ انفرادی طور پر یا کسی پارٹی کے ٹکٹ پر۔ یہی نہیں بلکہ جماعت اپنی انتخابی جدوجہد میں خاص طور پر یہ بات عوام الناس کے ذہن نشین کریگی کہ امیدوار بن کر اٹھنا اور اپنے حق میں ووٹ مانگنا آدمی کے غیر صالح اور نااہل ہونے کی پہلی اور کھلی ہوئی علامت ہے۔ ایسا آدمی جب کبھی اور جہاں کہیں سامنے آئے، لوگوں کو فوراً سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ ایک خطرناک شخص ہے اس کو ووٹ دینا اپنے حق میں کانٹے بونا ہے۔

(ترجمان القرآن۔ اکتوبر ۱۹۵۰ء صفحہ ۱۳)

مودودی صاحب کے اس فرمان کی روشنائی بھی ابھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ سابقہ پنجاب کے ۱۹۵۱ء کے انتخاب میں حصہ لینے کے لئے جماعت اسلامی اسلام کا نقاب اوڑھ کر آگے بڑھی اور ۲۳ نشستوں کے لئے اپنے نمائندے کھڑے کر دیئے۔ یہ نقاب "اسلامی پنچایتی نظام" تھا۔ وہ عملاً تو اسی جمہوری طریقہ انتخاب میں حصہ لے رہے تھے لیکن عامۃ الناس کو بیوقوف بنانے کے لئے اپنے لئے ایک علیحدہ اسلامی طریقہ انتخاب اسلامی پنچایتی نظام بھی تجویز فرما دیا تھا۔ اس نظام کی تفصیلات جماعت اسلامی کی جانب سے کوئی چودہ دفعات میں سامنے لائی گئیں۔ ان سب کے نقل کرنے کے راستے میں عدم گنجائش مانع ہے۔ اس لئے ہم ان میں سے چار پانچ دفعات انہی کی زبانی ہدیہ قارئین کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

اسلامی پنچایتی نظام

(۱) اس پورے علاقے میں جہاں انتخابات منعقد ہونے والے ہوں جگہ جگہ وسیع پیمانے پر لٹریچر تقریروں، اور انفرادی ملاقاتوں کے ذریعے سے جماعت کے مقصد، طریق انتخاب اور منشور کی تشریح کیجائے۔ اور لوگوں کو اسکی طرف دعوت عام دیجائے۔

(۲) جو لوگ اس دعوت کو قبول کریں ان کے سامنے حلقہ متفقین جماعت (جس کا دوسرا نام اسلامی پنچایت بھی ہوگا) کی رکنیت کا ترمیم شدہ عہد نامہ (جس کا نمونہ اس قرارداد کے آخر میں بطور ضمیمہ درج کیا جا رہا ہے) پیش کیا جائے اور انہیں اس عہد کی ذمہ داریاں اچھی طرح سمجھا کر اس پر ان سے دستخط لئے جائیں۔

(۳) جس محلے یا بستی یا گاؤں میں کم از کم پانچ آدمی متفقین کے عہد نامے پر دستخط کر چکے ہوں

وہاں ان کا حلقہ باقاعدہ منظم کر دیا جائے گا ....

(۶) ایک تھانے کے علاقے میں جتنے حلقہ ہائے متفقین بنیں ان سے ایک ایک دو نمائندے لے کر تھانے کی مرکزی پنچایت بنا دی جائے گی۔ انتخابی اغراض کے لئے ایک حلقہ انتخاب کی مرکزی پنچایت ان تھانوں کی مرکزی پنچایتوں یا ان کے نمائندوں کو ملا کر بنا لی جائے گی جو اس حلقہ انتخاب میں واقع ہوں

(۷) جس انتخابی حلقے کی کم از کم ایک تہائی بستیوں میں حلقہ ہائے متفقین قائم ہو چکے ہوں اور جہاں کی کل رائے دہندہ آبادی کا کم از کم پانچ فیصدی حصہ دوٹر کے عہد نامہ پر دستخط کر چکا ہو صرف اسکے بارے میں یہ غور کیا جا سکتا ہے کہ جماعت اسلامی وہاں انتخابی جد وجہد کرنا منظور کرے۔

(ترجمان القرآن۔ بابت مارچ۔ اپریل۔ مئی ۱۹۵۱ء صفحہ ۳۸۳/۱۲۷، ۳۸۴/۱۲۸)

اس نظام کے اسلامی ہونے کی دلیل

اہل علم کو اس نظام کے اسلامی ہونے کی کوئی دلیل نہ مل سکی تو انہوں نے امیر جماعت اسلامی سے دریافت کیا۔ انہوں نے اس کے اسلامی ہونے کی یہ دلیل دی۔

خلافتِ راشدہ میں کسی طریقہ کا موجود نہ ہونا اس کے ناجائز یا غیر اسلامی ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ آپ کے پاس اس طریقے کے ناجائز ہونے کی کوئی دلیل ہو تو ارشاد فرمائیں۔ خلفائے راشدین کو اگر جائز کام کی ضرورت پیش نہیں آئی تو انہوں نے اسے نہیں کیا۔ ہمیں ضرورت پیش آئی ہے تو ہم اسے کر سکتے ہیں۔

آپ کا یہ ارشاد کہ خلیفۂ وقت از خود عوام کے لئے نمائندے منتخب کر دیتا تھا۔ تاریخ کے ناقص مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ اس زمانے میں قبائلی نظام تھا۔ شیوخ قبائل آپ سے آپ اپنے قبیلے کے نمائندے ہوتے تھے۔ اگر الیکشن بھی ہوتا تو وہی لوگ چنے جاتے۔

(ایضاً صفحہ ۳۹/۱۶۷)

اسلامی طریقہ انتخاب پر عمل

جماعت اسلامی نے سابقہ پنجاب کے ۱۹۵۱ء کے انتخابات (جو مغربی جمہوریت کے طریقہ انتخاب کے مطابق تھے) میں حصہ لینے کے لئے اپنے اقدام کو اسلامی ثابت کرنے کے لئے اپنے طریقہ کو اسلامی قرار دیا۔ اسکے جو نتائج سامنے آئے وہ انہی کی زبانی یوں ہیں۔

(۱) (سابقہ) پنجاب کے (۳۷) انتخابی حلقوں میں تقریباً پچاس ہزار آدمی ایسے نکلے جنہوں نے ہماری انتخابی پالیسی کو صحیح سمجھ کر ووٹر کے عہد نامے پر دستخط کئے۔

(۲) ان حلقوں میں ۱۳۹۰ بستیاں ایسی تھیں جنہوں نے "صالح نمائندوں" کے انتخاب کے لئے مقامی پنچایتیں بنائیں۔

(۳) ان حلقوں میں جو مرکزی پنچایتیں بنائی گئیں ان میں ۲۱۱۹ نمائندوں نے عملاً شرکت کی اور اپنی حد تک پوری دیانتداری کے ساتھ ۵۳ ایسے آدمیوں کو اپنے اپنے حلقوں کی نمائندگی کے لئے چنا جو علمی اور اخلاقی حیثیت سے نمایاں طور پر دوسری پارٹیوں کے امیدواروں اور آزاد امیدواروں کے مقابلہ میں فائق تھے اور جن کی سیرت پر ان کے مخالفین بھی کوئی حرف نہ رکھ سکے۔

(ایضاً۔ صفحہ $\frac{۳۷۱}{۱۱۵}$)

اسلامی طریقہ انتخاب پر ایک دلچسپ اعتراض

اس اسلامی طریقہ انتخاب کے ساتھ ساتھ یہ بھی اعلان کر دیا گیا تھا کہ:

اگر کسی حلقہ نیابت کی پنچایت جماعت اسلامی کے کسی رکن پر اعتماد کا اظہار کر کے اسے اپنی نمائندگی کے لئے لینا چاہے گی تو جماعت اس رکن کی خدمات پیش کر دے گی۔

(ترجمان القرآن۔ اکتوبر ۱۹۵۰ء۔ صفحہ $\frac{۳۱۸}{۱۸}$)

چنانچہ اس طرح ان اسلامی پنچایتوں نے اسمبلی کی امیدواری کے لئے جن ۵۳ امیدواروں کو چنا، یا تو وہ جماعت اسلامی کے رکن تھے یا انہیں اس کے ساتھ کوئی اور وابستگی تھی۔ جماعت کے مرکزی حلقے سے امیر جماعت اسلامی کی بجائے مولانا امین احسن اصلاحی کو چنا گیا۔ جس کی وجہ سے اس جماعت کو ہر جگہ مندرجہ ذیل دلچسپ سوال کا سامنا کرنا پڑا:

"پنچایتی نظام اگر کسی جماعت کے امیر کو 'صالح نمائندہ' تجویز نہیں کر سکتا تو اس جماعت کے افراد کیونکر صالح ہو سکتے ہیں؟"

اس زمانے میں اس سوال نے خاصی گرما گرمی پیدا کر دی تھی۔ آخر امیر جماعت اسلامی کی طرف سے (اس کا سیدھا سادھا جواب دینے کے بجائے) یہ الزامی جواب دے کر معترضین کو خاموش کرنے کی کوشش کی گئی:۔

جواب نمبر ۲۔ کیا آپ کو کسی ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ کسی جماعت کے امیر کا نام کسی پنچایت کے سامنے پیش نہیں کیا گیا تھا یا کیا گیا اور اسے غیر صالح قرار دے کر رد کر دیا گیا۔ اگر ایسی کوئی

اطلاع آپ کو پہنچی ہے تو ضرور مجھے بھی اس سے مستفید فرمائیں اور اگر یہ محض ایک قیاس آرائی ہے جو آپ نے اپنی جگہ پر بیٹھ کر لی ہے تو آپ کو مجھ سے سوال کرنے کی بجائے اپنے اندازِ فکر کی اصلاح کرنی چاہیئے۔ علم و واقفیت کے بغیر آپ کا اس طرح کا قیاسات کرنا بجائے خود ہی کوئی بھلا کام نہ تھا کجا یہ کہ آپ اس شخص کے سامنے اس قیاس کو پیش فرمارہے ہیں جسے حقیقت حال معلوم ہے۔

(ترجمان القرآن۔ بابت مارچ۔ اپریل۔ مئی ۱۹۵۱ء صفحہ ۱۹۲)

انتخابات میں سخت ناکامی

اس طرح جماعت اسلامی نے اسلام کے نعرے لگاتے ہوئے جو اپنے ۵۳ امیدوار کھڑے کئے تھے ان میں سے مشکل ایک کامیاب ہو سکا۔ اور اسلامی طریقہ انتخاب سے منتخب کئے ہوئے باقی ۵۲ امیدواروں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

ووٹروں کی اخلاقی گراوٹ

لیکن بھلا جماعت اسلامی اس عوامی فیصلے کو اپنی شکست کیسے تسلیم کر سکتی تھی۔ اس نے اپنی شکست کا واحد سبب عوام کی اخلاقی گراوٹ قرار دیا اور ان کا تجزیہ اس نے ان الفاظ میں کیا۔

ہمارے ووٹروں کی اکثریت نے جس اخلاق کا ثبوت دیا وہ یہ تھا۔

(الف) کل ووٹروں کا ۷۰ فیصد کی حصہ وہ تھا جس کو سرے سے انتخاب سے کوئی دلچسپی ہی نہ تھی۔ اور یہ سوال کہ ملک کی باگ ڈور کس کے حوالے کی جانی چاہیئے ان کے لئے کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا تھا۔ یہ لوگ اپنے کام کاج میں مصروف رہے یا اپنے گھروں میں بیٹھے رہے اور انہوں نے جعلی ووٹروں کو موقع دیا کہ وہ بیس بیس مرتبہ جا کے ووٹ دیں اور قلیل التعداد ہونے کے باوجود کثیر التعداد اصلی ووٹروں کی رائے کو بے اثر بنا کر رکھ دیں۔

(ب) جو لوگ ووٹ دینے کے لئے آئے ان میں سے بہت سے وہ تھے جو آئے نہیں لائے گئے تھے اور جنہوں نے ووٹ ڈال کر کسی نہ کسی پر احسان دھرا ہے یا اسکی قیمت وصول کی ہے۔

(ج) پھر جو بطور خود آئے ان میں سے کوئی قطعی رائے قائم کر کے آنے والے کم تھے۔ ان لوگوں کا حال یہ تھا کہ انہوں نے پولنگ سٹیشن پر جا کر یا تو اپنے آپ کو اس بات کے لئے چھوڑ دیا کہ کوئی آگے بڑھ کر انہیں استعمال کر لے یا پھر انہوں نے رُخ ادھر کیا جدھر بھیڑ زیادہ دیکھی بعض کی ضمیر کی پستی کا حال یہ تھا کہ انہوں نے یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ ایک شخص واقعی اہل اور قابل ہے' اپنا ووٹ ایک نااہل اور ناقابل کو اس دلیل کے ساتھ دیا کہ اہل اور قابل آدمی کی کامیابی کا چونکہ امکان نہیں لہذا ہمارا ووٹ ضائع جائے گا۔

(د) ہمارے ووٹروں میں سے بے شمار ایسے بھی تھے جو بار بار وعدے کر کے مُکر جاتے تھے۔ اور آخر کار جدھر چاہا رُخ کر لیا۔ وعدہ خلافی کے روگ سے بہت کم لوگ بچ سکے ہونگے یہاں تک کہ ہمارے سامنے ایسی قطعی مثالیں موجود ہیں کہ مسجدوں کے اماموں اور بڑے مذہبی قسم کے لوگوں نے ضمیر اور وعدے کے خلاف رائے دی۔　　(ایضاً۔ صفحہ ۳۶۲/۱۰۹)

ملک کی اکثریت

یہ ہے ملک کی اکثریت کی اخلاقی حالت کا تجزیہ جس کے بارے میں ان انتخابات میں حصہ لینے سے پہلے انہوں نے یہ فرمایا تھا۔

اس ملک کی اکثریت ایمانداری کے ساتھ یہ رائے رکھتی ہے کہ اسلام کے اصولوں کی پیروی میں پاکستان کے باشندوں کی فلاح ہے۔ اس کو یہ حق حاصل ہونا چاہیئے کہ ملک کا نظام اس کی رائے کے مطابق ہے۔　　(ترجمان القرآن۔ جون ۱۹۴۸ء صفحہ ۵۸)

اسلامی طریقہ انتخاب اور بنیادی جمہوریتیں

قارئین ایک لمحہ کے لئے توقف فرما کر جماعت اسلامی کے "اسلامی طریقۂ انتخاب" کو ایک دفعہ پھر سامنے لائیں تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ بعد میں حکومت پاکستان نے جو بنیادی جمہوریتوں کا نظام اختیار کیا وہ ان کے اسلامی پنچایتی نظام ہی کی ترقی یافتہ شکل تھا۔ تقابل ملاحظہ ہو۔

(۱) اسلامی پنچایتی نظام میں کسی قانون ساز مجلس کے لئے نمائندے کا انتخاب تین مراحل سے گزرتا تھا پہلے گاؤں کی پنچایت، پھر تھانے کی پنچایت، اور پھر حلقۂ انتخاب کی مرکزی پنچایت۔ بنیادی جمہوریتوں میں یہ انتخاب صرف دو مرحلوں میں طے پاتا تھا۔ یعنی پہلے مرحلے پر بنیادی جمہوریتوں کا انتخاب اور پھر ان ممبران کے ذریعے مجلس قانون ساز کے نمائندے کا انتخاب۔

(۲) اسلامی پنچایتوں کے جہاں ایک ایک دو دو نمائندے دوسرے مراحل کے انتخاب میں حصہ لیتے تھے وہاں بنیادی جمہوریتوں کے تمام ارکان بالغ حق رائے دہی کی بنیاد پر منتخب کئے جاتے تھے اور پھر وہ سب کے سب مجالس قانون ساز کے نمائندوں کا انتخاب کرتے تھے۔

(۳) "صالح نمائندوں" کے انتخاب کے لئے جہاں اسلامی پنچایت سسٹم میں پانچ فیصدی ووٹروں کا فیصلہ کافی سمجھا جاتا تھا وہاں بنیادی جمہوریتوں کے اراکین کے لئے اکثر و بیشتر سو فیصدی۔

ان تفصیلات کو سامنے رکھنے سے واضح ہو جائے گا کہ اصولاً بنیادی جمہوریتوں کا نظام جماعت اسلامی کے پنچایتی سسٹم کے عین مطابق تھا اور عملاً اس سے کچھ بہتر ہی۔

مغربی جمہوریت قرآن و سنت کا منشا بن گئی

جونہی حکومت نے ان کے اسلامی پنچایتی نظام کو

ترمیمی شکل میں اختیار کیا وہ سارا نظام یکایک ناپاک ہوگیا اور اسکی جگہ وہ مغربی جمہوریت جسے مولانا مودودی صاحب انسانیت کے خلاف ایک ناپاک جسارت قرار دیتے تھے یکایک قرآن وسنت کے مطابق ہوگئی۔ یہ تاریخی فتوے بھی انہی کی زبانی سنیئے۔

> دوسری بنیاد جس پر اتفاق ہوسکتا ہے "جمہوریت" ہے۔ یہ خود قرآن وسنت کا منشا بھی ہے اور باشندگانِ ملک کی خواہشات کا تقاضا بھی۔
>
> (ترجمان القرآن۔ بابت اگست ۱۹۵۵ء صفحہ ۳۶۲/۲)

لیکن یہ حضرات چونکہ ایک عرصے سے جمہوریت کی مخالفت کررہے تھے، اس اعلان کے بعد انہیں طرح طرح کے اعتراضات کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن تاویلات کے فن کے تو یہ ماہر ہیں۔ اسلئے انہوں نے یوں گول مول الفاظ میں اپنے مسلک کی وضاحت کرنی شروع کی۔

اجتماعی نظام یا جمہوریت کے قیام کی فکر

> ایک ایسی جماعت جس کا مقصد صرف روحانی تسکین کا سامان فراہم کرنا نہ ہو بلکہ جو مادی تہذیب کے ہمہ گیر تسلط کو ختم کرنا اور اس کی جگہ ایک ایسی تہذیب کو نافذ کرنا چاہتی ہو جو روح اور اخلاق کی نشو ونما کے لئے سازگار ماحول مہیا کرسکے، کیا اس کے لئے اس کے سوا چارہ کار ہے کہ وہ سب سے پہلے ایک ایسا اجتماعی نظام قائم کرنے کی فکر کرے جس میں اسے کام کرنے کی نسبتاً آزادی حاصل ہو۔ اگر بے شمار ہاتھ آپ کے گلے کی طرف بڑھ رہے ہوں، اور آپ کو اس امر کا اختیار دے دیا جائے کہ ان میں سے کسی ایک کے ہاتھ میں گردن دے دو۔ آپ فطری طور پر اسی ہاتھ کو قبول کرلیں گے جس کی انگلیاں نسبتاً نرم اور جس کی گرفت نسبتاً کمزور ہو۔ تاکہ آپ کسی طرح سانس تو لے سکیں۔
>
> (ترجمان القرآن۔ بابت اپریل ۱۹۶۵ء صفحہ ۱۴۱/۴۹)

ناجائز جائز قرار پاگیا

اسی طرح جو چیزیں ۱۹۵۱ء کے انتخابات میں ناجائز تھیں ان کے لئے جواز کا راستہ ہموار کیا گیا۔ اس میں سب سے اہم سوال اپنے آپ کو بطور امیدوار پیش کرنا تھا۔ اب اس ناجائز مسئلہ کو یوں سندِ جواز عطا فرمادی گئی۔

> جماعتِ اسلامی نے ۱۹۵۱ء کے انتخابات کے موقع پر ایک پالیسی کا اعلان کیا تھا اور وہ یہ تھی کہ امیدواری چونکہ اسلام میں ناجائز ہے اسلئے ہم نہ خود امیدوار بن کر کھڑے ہونگے اور نہ کسی امیدوار کو ووٹ دینگے۔ بعد میں تجربات سے ہم کو معلوم ہوا کہ ہم ابھی اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ ہر ضمنی اور عام انتخابات میں پورے ملک کی ہر نشست کے لئے اپنے معیار مطلوب کے مطابق

موزوں امیدوار کھڑے کر سکیں۔ اس بنا پر ہم نے سابقہ پالیسی میں تغیر کر دیا کہ ہم خود تو امیدوار بن کر کھڑے ہونے سے بدستور مجتنب رہیں گے، لیکن فاسد عناصر کے شر کو رفع کرنے اور انکے مقابلے میں نسبتاً صالح اور اسلامی نظام کے حامی عناصر کو آگے بڑھانے کے لئے جن امیدواروں کی تائید ناگزیر محسوس ہو گئی انہیں ووٹ دینگے بھی اور دلوائیں گے بھی۔

(ترجمان القرآن۔ بابت مئی ۱۹۵۸ء، صفحہ ۱۲۳)

چونکہ ضمیر میں خلش موجود تھی کہ اسی چیز کو وہ پہلے ہولناک دہل حرام قرار دیتے رہے ہیں۔ اسلئے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو خود پوری طرح اطمینان نہ ہوا تھا۔ اسلئے ایک دفعہ پھر ان کی جانب سے یہ تصریح کی گئی۔

ہر معقول آدمی بیک نظر محسوس کر لیگا کہ ہماری یہ نئی پالیسی ٹھیک ٹھیک دینی نظام کے مطابق ہے اور اس میں در اصل کوئی اصول شکنی نہیں کی گئی۔ (ایضاً)

جی بالکل نہیں۔ آپ کی ہر بات دینی نظام کے ٹھیک ٹھیک مطابق ہے اور آپ کبھی اصول شکنی نہیں کرتے!

صالح نمائندے

اس کے بعد سوال سامنے آیا کہ کیا آنے والے انتخابات میں جماعت اسلامی کسی اور پارٹی کے امیدوار کی بھی حمایت کریگی کیونکہ ان کا فیصلہ یہ تھا کہ امیدوار کا صالح ہونا ضروری ہے اور صالحین صرف ان کی جماعت کے اندر ہیں۔ لیکن جب امیر جماعت اسلامی سے اس بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ جماعت اسلامی ان امیدواروں کی حمایت کریگی جن کا کردار اور چلن ماضی میں بے داغ رہا ہو اور جو اسلامی نظریہ کے لئے کام کرے (بحوالہ روزنامہ امروز لاہور۔ مورخہ ۲۰ اگست ۱۹۶۳ء)

کنونشن لیگ کا فرشتہ بھی غلط

لیکن جب ان سے پوچھا گیا کہ اگر کنونشن مسلم لیگ کا کوئی امیدوار جماعت اسلامی کے معیار پر پورا اترتا ہو تو کیا یہ جماعت اسکی حمایت کریگی تو انہوں نے کہا کہ

اگر کنونشن مسلم لیگ کسی فرشتے کو بھی امیدوار کھڑا کرے تو جماعت اسکی حمایت نہیں کریگی۔ کیونکہ ہمیں اسکے اصولوں سے اتفاق نہیں۔ (ایضاً)

اور اس کے بالمقابل یہ بھی فرمایا کہ:

لیکن ہندو کی حمایت جائز

اگر ایک ہندو جمہوری نظام کی حمایت کرتا ہے تو اسے میری تائید حاصل ہوگی۔ اسلئے کہ اس نے یہ اصول تو تسلیم کر لیا کہ ملک کا نظام اکثریت کے نظریئے کے مطابق ہونا چاہیئے۔ (ایضاً)

آپ نے غور فرمایا کہ ایک ہی سانس میں دین کے کیسے عظیم نکات بیان کئے گئے ہیں یعنی :۔

(۱) جماعت اسلامی صرف صالح امیدواروں کی حمایت کرے گی ۔

(۲) کنونشن مسلم لیگ کا امیدوار کوئی فرشتہ بھی ہوگا تو جماعت اسلامی اسکی مخالفت کریگی کیونکہ اس کے اصولوں سے جماعت اسلامی کو اختلاف ہے ۔ اور

(۳) اگر ایک ہندو جمہوری نظام کی حمایت کریگا تو جماعت اسلامی اس کی تائید کریگی اسلئے کہ اس کے صالح ہونے میں شک و شبہ ہی نہیں ہو سکتا ۔

(۴) اور ہندو کی حمایت اس جمہوری نظام کی تائید کے صلے میں ہوگی جسے مودودی صاحب تشکیل پاکستان سے پہلے نوع انسانی کے لئے بدترین لعنت قرار دیا کرتے تھے ۔

نیز انہوں نے انتخاب کے سلسلہ میں اپنی جماعت کا نصب العین یہ بھی بیان کیا تھا کہ ،

وہ گمراہ اور آزمائے ہوئے غلط کار لوگوں کے مقابلے میں ان لوگوں کو انتخاب کے لئے قوم کے سامنے لانا چاہتی ہے جو دیندار بھی ہوں اور دیانتدار بھی اور اس کے ساتھ حکومت چلانے کی اہلیت بھی رکھتے ہوں ۔ (منشور جماعت اسلامی صفحہ ۱۲)

اب ظاہر ہے کہ اس ہندو سے بڑھ کر دیندار، دیانتدار اور حکومت چلانے کی اہلیت کا مالک اور کون ہو سکتا ہے جو اکثریت کے نظام کے مطالبہ میں مودودی صاحب کا ہمنوا ہو ۔

اس مقام پر قارئین چند اوراق پیچھے لوٹ جائیں اور دیکھیں کہ مودودی صاحب نے جمہوری طریق کو غیر اسلامی (لادینی) قرار دینے کے لئے ایک دلیل یہ بھی دی تھی کہ اس میں حکومت کے کاروبار میں غیر مسلم بھی برابر کے شریک ہونگے ۔ اب وہی مودودی صاحب ایک ہندو کو حکومت کے کاروبار میں شریک ہونے کے لئے ایک مسلمان پر ترجیح دیتے ہیں !

جمہوریت کیلئے تعاون کی پیشکش

یہی نہیں بلکہ وہ جماعت جو قائداعظم کی اپیل پر پاکستان کے حق میں ووٹ ڈالنے پر تیار نہ ہوئی اس نے جمہوریت کا نعرہ لگاتے ہوئے اعلان کیا کہ وہ ہر جمہوریت پسند پارٹی سے تعاون کرنے کے لئے تیار ہے ۔ اگست ۱۹۶۲ء میں راولپنڈی پریس کلب میں فرمایا گیا ۔

"جماعت کسی بھی ایسی پارٹی کے ساتھ تعاون کے لئے تیار ہے جو ملک کی خدمت کرنا چاہتی ہے ۔ جماعت کو دوسری سیاسی جماعتوں سے کوئی گلہ نہیں ۔

(نوائے وقت ۲۸ اگست ۱۹۶۲ء)

چنانچہ دوسری سیاسی پارٹیوں سے تعاون کرنے اور ان کا تعاون حاصل کرنے کے لئے بڑے زور شور سے مہم شروع کی گئی۔ اور جب بے اصولی اصول بن جائے تو ایسا تعاون حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں رہ جاتا۔

سیاسی پارٹیوں کی گول میز کانفرنس

اس تعاون کا ایک فوری فائدہ یہ ہوا کہ سابق صدر کی بلائی ہوئی سیاسی پارٹیوں کی گول میز کانفرنس میں انہیں ایک مقام حاصل ہو گیا اور اس کے نتیجے کے طور پر انہوں نے اپنے آپ کو کچھ اقتدار کے قریب ہونا محسوس کیا۔ اقتدار کی جھلک نے ان کو ایسا مدہوش کر دیا کہ انہوں نے .... اپنے اس "قیمتی اصول" پر عمل کرنا شروع کر دیا:۔

اقتدار چھین لو

اسلام کی نگاہ میں یہ بات ہرگز کافی نہیں ہے کہ تم نے خدا کو خدا اور اسکے قانون کو قانون برحق مان لیا۔ نہیں! اس کے ماننے کے ساتھ ہی آپ سے آپ یہ فرض تم پر عاید ہو جاتا ہے کہ جہاں بھی تم ہو جس سرزمین پر بھی تمہاری سکونت ہو وہاں خلق خدا کی اصلاح کے لئے اٹھو، حکومت کے غلط اصول کو صحیح اصول سے بدلنے کی کوشش کرو۔ ناخدا ترس اور شر پسند قسم کے لوگوں سے قانون ساز اور فرمانروائی کا اقتدار چھین لو۔

(خطبات مودودی صاحب۔ صفحہ ۲۳۳)

خیر اس کا جو نتیجہ نکلنا تھا وہ ظاہر ہے۔ ملک کو تباہی سے بچانے کے لئے ایک دفعہ پھر افواج پاکستان کو آگے بڑھنا پڑا۔

اسلامی دستور یا ۱۹۵۶ء کا دستور

حالات کے معمول پر آجانے کے بعد ان حضرات نے پھر اپنی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ یہ سرگرمیاں اسلامی نظام حکومت کے قیام کے لئے نہ تھیں بلکہ مغربی جمہوریت کو دوبارہ نافذ کرنے کے لئے۔ ۱۹۵۶ء کا دستور مغربی جمہوریت کے اصولوں پر مبنی تھا۔ اس میں انتخاب بھی اسی مغربی جمہوریت کے طریقے کے مطابق ہوتے ہیں۔ یہ وہی طریقہ ہے جس کے خلاف اسلام ثابت کرنے کے لئے یہ حضرات ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہے ہیں۔ آج کل ان کی سرگرمیوں کا محور صرف ۱۹۵۶ء کے آئین کی بحالی ہے اور اس کے لئے وہ اس حد تک پہنچ چکے ہیں کہ جب روزنامہ پیام لاہور کے نمائندے نے امیر جماعت اسلامی مغربی پاکستان سے دریافت کیا کہ کیا آپ اسلامی دستور چاہتے ہیں یا ۱۹۵۶ء کا، تو انہوں نے بغیر کسی تردد کے فرمایا کہ:۔

"۱۹۵۶ء کا دستور" (بحوالہ۔ نصرت۔ لاہور ۲۸ اگست ۶۹ء صفحہ ۱۸)

حرفِ آخر

یہ ہیں طریقۂ انتخاب کے متعلق جماعتِ اسلامی کی قلابازیاں۔ وہی مغربی جمہوریت جو ان کے نزدیک انسانیت کے لئے لعنت تھی، قرآن و سنت کا منشا بن گئی۔ اس جمہوریت کا وہی طریقۂ انتخاب جو متاعِ پاکستان کے وقت اتنا ناپاک تھا کہ پاکستان کے حق میں ووٹ تک ڈالنا اسلام سے انحراف ہوتا تھا۔ آج ۱۹۵۶ء کے دستور کی بحالی کے نعرے کے تحت اسی کا جھنڈا بلند کیا جا رہا ہے۔ ان کا اپنا اسلامی طریقۂ انتخاب جسے حکومت نے ترمیمات کے بعد اختیار کر لیا تو وہ ایسا خلافِ اسلام ہوا کہ جماعتِ اسلامی نے اسے اپنے ہاتھوں دفن کر دیا۔

اب عوام بیچارے پریشان ہیں کہ ان کے کون سے عمل کو اسلام کے مطابق سمجھیں اور کون سے کو اسلام کے خلاف۔ اور اس بیچارگی کے عالم میں رہ رہ کر آسمان کی طرف تکتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے!

بقیہ "حقائق و عبر" صفحہ ۲۲ سے مسلسل

ہم اتنا لکھ چکے تھے کہ ۱۱ ستمبر ۱۹۶۹ء کا نوائے وقت ہمارے سامنے آیا۔ اس میں ایک چوکھٹے میں، رنگین سطح پر، مودودی صاحب کا ایک بیان شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "قائداعظمؒ کو مولانا مودودی کا خراجِ عقیدت"۔ اس میں "منجملہ دیگر امور" یہ بھی کہا گیا ہے کہ

> قائداعظمؒ کو اس امر کا بخوبی اندازہ تھا کہ مسلمانوں کی قوت، بقا اور نشوونما کا اصل سرچشمہ اسلام ہے۔ اسلئے انہوں نے بار بار اس کا اعلان کیا کہ پاکستان میں اسلامی جمہوری نظام قائم کیا جائے گا۔

یعنی قائداعظمؒ کم از کم ۱۹۳۷ء سے، بار بار اعلان کر رہے تھے کہ پاکستان میں اسلامی نظام قائم ہوگا۔ لیکن مودودی صاحب ۱۹۴۱ء میں خبر دار رہے تھے کہ مسلمانوں کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ پاکستان میں اسلامی نظام قائم کیا جائے گا۔

اور اس کے باوجود یہ بزرگوار، نہ صرف یہ کہ از صالحین ہیں بلکہ امیر الصالحین ہیں! ہماری ان مقدس اصطلاحات کے ایک جدید لغت مرتب کرنے کی ضرورت کس قدر شدید ہوتی جا رہی ہے!

نکاح کے شرعی احکام

ہمارے ہاں ایک سوال پیدا ہوا ہے کہ کیا شادی کرنا ہر مسلمان (مرد اور عورت) پر فرض ہے، یا اس کا فیصلہ ہر شخص کے انفرادی حالات پر منحصر ہے کہ اگر وہ مناسب سمجھے تو شادی کرے اور اگر ایسا نہ سمجھے تو تجرد کی زندگی بسر کرے۔

جہاں تک قرآن کریم کا تعلق ہے اس میں یہ کہیں نہیں آیا کہ شادی کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اس میں اتنا ہی کہا گیا ہے کہ مرد اور عورت کے جنسی تعلقات اسی صورت میں جائز ہیں جب ان کا باہمی نکاح ہو چکا ہو۔ نکاح کے بغیر جنسی تعلق زنا ہے۔ اور زنا سنگین ترین جرم ہے۔ چنانچہ سورۂ نور میں ہے۔

وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا حَتَّىٰ يُغْنِيَهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ ۔ (۲۴/۳۳)

جن لوگوں کو نکاح کی توفیق حاصل نہ ہو[1]، انہیں چاہیئے کہ وہ ضبطِ نفس سے کام لیں تاآنکہ اللہ انہیں اس کا مقدور دیدے۔

اس سے واضح ہے کہ شادی اسی شخص کو کرنی چاہیئے جو متاہل زندگی (بیوی بچوں) کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق رکھتا ہو۔ جو اس کی توفیق نہ پاتا ہو اسے شادی نہیں کرنی چاہیئے۔ اسے ضبطِ نفس (حفاظتِ عصمت) سے کام لینا چاہیئے۔

جہاں تک ضبطِ نفس کا تعلق ہے، ایک بنیادی نکتہ سمجھ لینا ضروری ہے۔ بعض لوگ اس غلط فہمی

---

[1] اس میں مناسب رشتہ نہ ملنا اور متاہل زندگی کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی مقدرت نہ ہونا، دونوں باتیں شامل ہو سکتی ہیں۔

میں مبتلا ہوتے ہیں (اور مغربی تصورِ زندگی نے — جو حیوانوں سے بھی پست تر سطح تک پہنچ چکی ہے — اس غلط فہمی کو پیدا کیا یا تقویت دی ہے) کہ جنسی جذبہ کی تسکین کے معاملہ میں ضبطِ نفس ممکن نہیں۔ اور اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو وہ طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ دونوں مفروضے غلط ہیں۔ قرآن کریم نے بعض چیزوں کے کھانے کو بھی حرام قرار دیا ہے اور زنا کو بھی۔ کھانے کی اشیاء کی صورت میں تو یہ کہا ہے کہ اگر کوئی شخص بھوک سے مجبور ہو جائے (جسے اضطراری حالت کہتے ہیں) تو وہ بھوک مٹانے کی حد تک حرام اشیاء کھا سکتا ہے لیکن جنسی تعلق کے سلسلہ میں یہ نہیں کہا کہ اضطراری حالت میں اس جذبہ کی تسکین حرام طریقہ سے کی جا سکتی ہے۔ اس سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے جنسی جذبہ میں اضطراری حالت پیدا نہیں ہو سکتی (یہ اور بات ہے کہ کوئی شخص از خود ایسی حالت پیدا کر لے جسے وہ اضطراری کہہ دے۔ لیکن خود پیدا کردہ حالت کو اضطراری کیسے کہا جا سکتا ہے۔ اضطراری حالت وہ ہے جسے پیدا کرنے پر انسان کا اختیار نہ ہو) باقی رہا ضبطِ نفس سے مختلف امراض میں مبتلا ہو جانے کا خیال۔ سو یہ بھی واہمہ ہے۔ ہمارے سامنے ایسی مثالیں موجود ہیں کہ لوگوں نے باعفت زندگی بسر کی اور ان کی صحت قابلِ رشک حد تک اچھی رہی۔ امراض اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب انسان جنسی جذبہ کو مشتعل کرتا ہے اور اسکی تسکین فطری طریق سے نہ کرے۔ یاد رہے کہ جنسی جذبہ — بھوک اور پیاس کے تقاضا کی طرح — از خود کبھی بیدار نہیں ہوتا۔ اسے اپنے خیالات سے بیدار کیا جاتا ہے۔ (تفصیل ان امور کی، ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتاب — سلیم کے نام خطوط۔ جلد دوم میں ملے گی)۔

بہرحال، قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ جس شخص کو مناسب رشتہ نہ ملے یا اسے متاہل زندگی کی ذمہ داریاں سنبھالنے کا مقدور نہ ہو، وہ شادی نہ کرے بلکہ ضبطِ نفس سے کام لے۔ اس نے معاشرہ سے کہا کہ وَ اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَ الصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ اِمَآئِكُمْ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۔ (۲۴/۳۲) جو لوگ غیر شادی شدہ ہوں (خواہ کنوارے اور خواہ رنڈوے مرد یا بیوہ عورتیں)۔ نیز تمہارے غلاموں اور لونڈیوں میں سے جنہیں تم دیکھو کہ متاہل زندگی بسر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، تمہیں (اسلامی معاشرہ کو) چاہیئے کہ ان کی شادی کا مناسب انتظام کر دے اور دیکھے کہ وہ مالی مشکلات سے دوچار نہ ہوں۔ اس سے واضح ہے کہ شادی اسے کرنی چاہیئے (۱) جو متاہل زندگی بسر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اور (۲) جو اس زندگی کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے قابل ہو۔ اسلامی معاشرہ معاشی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ایسے لوگوں کی مدد کرے۔ لیکن جہاں معاشرہ ایسا انتظام نہ کرے اور ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا معاملہ انفرادی رہ جائے، تو شادی

اسے ہی کرنی چاہیئے جو ان ذمہ داریوں کو سنبھال سکے۔

اس سلسلہ میں اس قدر مزید وضاحت کی بھی ضرورت ہے کہ "ذمہ داریاں" صرف مالی ہی نہیں ہوتیں ـــــ ازدواجی زندگی کی ذمہ داریاں اور بھی بہت سی ہوتی ہیں۔ مثلاً میاں بیوی میں باہمی مؤدت، محبت اور سکون۔ گھر میں خوشگوار فضا کا پیدا کرنا اور قائم رکھنا۔ بچوں کی (نہ صرف پرورش بلکہ) تعلیم اور (سب سے بڑی چیز ان کی صحیح) تربیت۔ اگر کوئی شخص محسوس کرے کہ وہ طبعاً ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے قابل نہیں یا اس نے ایسے اہم کام اپنے ذمے لے رکھے ہیں یا مستقبل میں اس کے پروگرام ایسے ہیں جن کی وجہ سے وہ ان ذمہ داریوں کو کما حقہٗ پورا نہیں کرسکیگا تو اسے بھی متاہل زندگی اختیار نہیں کرنی چاہیئے، تجرد کی باعصمت زندگی بسر کرنی چاہیئے۔

اس موضوع پر ہم اس سے زیادہ تفصیلی گفتگو کر سکتے تھے، لیکن درحقیقت ہم سے پوچھا یہ گیا ہے کہ اس باب میں فقہ کا فیصلہ کیا ہے۔ کیونکہ ہمارے ہاں اس وقت قرآن کا قانون نہیں بلکہ فقہ کا قانون رائج ہے۔ کتبِ فقہ میں اس باب میں بڑی لمبی چوڑی بحثیں آئی ہیں لیکن حسنِ اتفاق سے مصر سے ایک کتاب ایسی شائع ہوئی ہے جس میں ایک فقہ (حنفی) ہی نہیں بلکہ ائمہ اربعہ (حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی) فقہ کے فیصلے، نہایت اختصار لیکن بڑے سلیقے سے یکجا کر دیئے گئے ہیں۔ ان استفسارات کے جواب میں ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس کتاب کے اس باب کا ترجمہ پیش قارئین کر دیا جائے جس کا تعلق نکاح سے ہے۔ کتاب کا نام ہے

كتابُ الفقه على المذاهب الأربعة

اس کی چوتھی جلد کا پہلا باب "کتاب النکاح" ہے جس کا ذیلی عنوان ہے "حکم النکاح"۔ اس ذیلی عنوان کا سلیس ترجمہ درج ذیل ہے۔ واضح رہے کہ ہم فقہ کے ان مسائل پر کسی قسم کا تبصرہ نہیں کرینگے نیز ان مسائل میں جو لونڈیوں کا ذکر آتا ہے تو فقہ کی رُو سے لونڈیوں کا رکھنا جائز ہے۔ حالانکہ قرآنِ کریم نے غلامی کو بند کر دیا ہے۔ بہرحال، ہم ان فقہی فیصلوں کو بلا تبصرہ درج ذیل کرتے ہیں۔ قرآنِ کریم کے احکام پہلے درج کئے جا چکے ہیں۔

ــــــ (٠) ــــــ

نکاح کے پانچ شرعی حکم ہیں:-

(۱) واجب یعنی فرض۔ (۲) حرام (۳) مکروہ۔ (۴) سنت یا مستحب۔

(۵) مباح یعنی جائز۔ یعنی جس کی مرضی آئے نکاح کرے اور دل نہ چاہے تو دور رہے۔ (صفحہ ۶۳)

وہ مواقع جن میں نکاح فرض ہو جاتا ہے یا حرام ہو جاتا ہے' کے بارے میں چاروں فقہی مذاہب میں مختلف تفصیلات ہیں جو یہ ہیں :-

فقہ مالکی

فرض وہ مرد جسے نکاح سے رغبت ہے اور نکاح نہ کرنے کی صورت میں اس کے زنا میں پڑ جانے کا خدشہ ہے اور نہ ہی روزے رکھ کر وہ اپنے آپ کو قابو میں رکھ سکتا ہے۔ اور اسے اس بات پر بھی قدرت نہیں کہ وہ کوئی لونڈی خرید سکے جس سے اُسے آزاد عورت سے شادی کی ضرورت نہ رہے تو اس حالت میں اس پر نکاح فرض ہو جاتا ہے۔ اور اگر وہ کسب حلال سے عاجز ہے۔ تو نکاح کی فرضیت کے لئے تین شرطیں ہیں۔

(۱) اسے زنا میں پڑنے کا اندیشہ ہو۔

(۲) یا وہ روزے رکھنے سے عاجز ہو جو اُسے زنا سے بچا سکیں۔ یا وہ روزے رکھنے پر تو قدرت رکھتا ہو لیکن وہ اس کے لئے کفایت نہ کرتے ہوں۔

(۳) وہ لونڈی نہ خرید سکتا ہو جو اسے کفایت کرے۔ (ایضاً)

اگر وہ نکاح کے سلسلے میں مندرجہ ذیل تین باتوں پر قادر ہو۔

(۱) اسے شادی کر لینے پر قدرت حاصل ہے۔

(۲) یا وہ روزے رکھ کر اپنی شہوت کو قابو میں رکھ سکتا ہے

(۳) یا وہ آزاد عورت کی بجائے لونڈی سے نکاح کر سکتا ہے۔

تو اسے اختیار ہے کہ ان میں سے کوئی صورت اختیار کرے۔ یعنی یہ اسکی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ شادی کرے یا روزے رکھے یا لونڈی خرید لے۔ لیکن اگر وہ شادی والی صورت اختیار کر لے تو زیادہ اچھا ہے۔

(صفحہ ۵)

لیکن بعض مالکی فقہاء کے نزدیک شادی کے لئے حلال کی کمائی لازمی ہے۔ یعنی اگر اسے زنا میں پڑنے کا خوف بھی ہے اور روزے رکھنے سے بھی عاجز ہے اور لونڈی بھی حاصل نہیں کر سکتا تو اس کے باوجود اس پر نکاح فرض نہ ہوگا جب تک اسے حلال کی کمائی پر قدرت حاصل نہ ہو جائے۔ اگر اس سے زنا سرزد ہونے کا خطرہ ہے تو اس پر فرض ہے کہ وہ اپنی خواہشات سے لڑائی کرے اور یہ نہ کرے کہ چوری کر کے شادی کے اخراجات وغیرہ پورے کرے۔ کیونکہ ایک حرام سے بچنے کے لئے دوسرا حرام

کا ارتکاب اچھا نہیں ہے۔

یہ تو مردوں کے بارے میں احکام ہیں۔ عورت پر شادی اس وقت لازم ہو جاتی ہے جب وہ خود اپنے اخراجات پورے کرنے سے عاجز ہو جائے اور مفسد لوگوں کی لالچی آنکھیں اس پر پڑ رہی ہوں اور وہ یہ سمجھے کہ شادی سے اسکی پردہ پوشی اور حفاظت ہو سکیگی۔

نکاح کب حرام ہوتا ہے؟

اور ایسے شخص پر جسے زنا میں پڑنے کا کوئی اندیشہ نہیں اور وہ عورت پر حلال کی کمائی سے خرچ کرنے سے عاجز ہو تو اس کے لئے نکاح کرنا حرام ہے۔ اسی طرح اگر وہ عورت سے مباشرت کے قابل بھی نہیں لیکن اگر عورت مرد کی اس کمزوری کے باوجود راضی ہو جائے تو پھر نکاح جائز ہے۔ اسی طرح اگر عورت کو یہ معلوم ہو کہ اس کا ہونیوالا خاوند اسکے اخراجات پورے نہیں کر سکیگا لیکن اسکے باوجود وہ نکاح پر رضامند ہو جائے تو پھر نکاح اس شرط پر جائز ہے کہ وہ عورت نیک چلن ہو۔ لیکن جب عورت کو یہ معلوم ہو کہ اس کے ہونے والے خاوند کی کمائی حرام سے ہے تو پھر کسی صورت میں نکاح جائز نہیں چاہے عورت راضی ہی کیوں نہ ہو۔

(ایضاً)

سنّت یا مستحب

اگر کسی شخص کو نکاح سے تو کوئی رغبت نہیں لیکن وہ اضافہ نسل چاہتا ہے تو اس کے لئے نکاح مستحب ہوگا لیکن ان شرائط کے ساتھ کہ اسے کسب حلال پر قدرت ہے اور بیوی سے مباشرت کے قابل ہے۔ وگرنہ نکاح اس کے لئے حرام ہو جائے گا۔

لیکن اگر اس کو یہ شادی بھلائی کے کاموں سے روک دے تو اس صورت میں یہ مکروہ ہوگی۔

کسی آدمی کو نکاح میں رغبت ہو اور اسے زنا میں پڑنے کا بھی کوئی خدشہ نہ ہو، تو اگر وہ نکاح کی ذمہ داریاں پوری کر سکتا ہو تو یہ اس کے لئے مستحب ہے۔ چاہے اُسے اضافہ نسل سے دلچسپی ہو یا نہ ہو اور چاہے یہ شادی اُسے بھلائی کے کاموں سے روکے یا نہ روکے۔

عورت پر مرتب ہونے والے احکام

ان احکامات کی رُو سے عورت کو بھی وہی حقوق حاصل ہیں جو مرد کو حاصل ہیں۔ اگر اسے نکاح سے کوئی رغبت نہیں لیکن اضافہ نسل چاہتی ہے اور خاوند کے حقوق پورے کر سکتی ہے تو اس کے لئے شادی مستحب ہے۔ بشرطیکہ یہ شادی اسے بھلائی کے کاموں سے نہ روکے۔ اور اگر ایسی شادی اس عورت کو بھلائی کے کاموں سے روکے گی تو پھر یہ اس کے لئے حرام یا مکروہ ہو جائیگی۔

لیکن اگر اس عورت کو شادی سے رغبت ہے اور اسے زنا میں پڑنے کا بھی کوئی خدشہ نہیں اور

وہ اپنے اخراجات کا خود بندوبست کر سکتی ہے اور شادی کے بغیر بھی وہ محفوظ ہے تو اس صورت میں نکاح اس کے لئے مستحب (اچھا) ہوگا چاہے اسے اضافہ نسل کی خواہش ہو یا نہ ہو۔ اور چاہے اس شادی سے اسکے بھلائی کے کام متاثر ہوتے ہوں یا نہ۔

لیکن اگر اسے زنا میں پڑنے کا خدشہ ہے اور اپنے اخراجات مہیا کرنے پر بھی اسے قدرت نہیں جس پر اسکی پردہ پوشی منحصر ہے تو ایسی صورت میں اس پر شادی فرض ہوگی۔ (صفحہ ۵)

نکاح کب مکروہ ہو جاتا ہے

کوئی مرد یا عورت جسے نکاح سے کوئی رغبت نہ ہو۔ اور اسے یہ خدشہ ہو کہ وہ شادی کی بعض ذمہ داریوں سے کماحقہٗ عہدہ برآ نہیں ہو سکیگا، یا ایسی شادی انہیں بھلائی کے کاموں سے روک دے گی۔ تو پھر ایسی شادی مکروہ ہے چاہے انہیں اولاد کی خواہش ہو یا نہ ہو۔

مباح یعنی جائز

فقہی اصطلاح مباح کا مفہوم یہ ہے کہ اس پر عمل کرنے والا شرعی لحاظ سے مختار ہے کہ چاہے وہ اس چیز کو اختیار کرے یا نہ کرے۔ ایسا شخص جسے نہ تو نکاح سے کوئی رغبت ہے اور نہ ہی اولاد کی خواہش اور شادی کے واجبات پورا کرنے پر قادر ہے اور یہ شادی اسے بھلائی کے کاموں سے بھی نہیں روکتی تو وہ مختار ہے چاہے شادی کرے یا نہ کرے۔

(صفحہ ۶)

حنفی فقہ

حنفی فقہ کے مطابق اگر چار شرائط پائی جائیں گی تو شادی فرض ہو جائے گی۔ وہ شرائط یہ ہیں۔

(۱) اسے زنا کے ارتکاب کا یقین کامل ہو۔ لیکن اگر اسے صرف خدشہ ہے تو پھر شادی فرض نہ ہوگی۔

(۲) اسے روزے رکھنے پر قدرت حاصل نہ ہو جو اسے زنا میں پڑنے سے روک سکے۔ لیکن اگر وہ روزوں کے ذریعے اپنی خواہشات کو قابو میں رکھ سکتا ہے تو اس حالت میں اس پر شادی فرض نہ ہوگی بلکہ اس کو اختیار ہوگا کہ وہ چاہے روزے رکھ لے اور چاہے شادی کر لے۔

(۳) وہ کوئی لونڈی حاصل نہ کر سکتا ہو جو اسے نکاح سے مستغنی کر دے لیکن اگر وہ کہیں سے لونڈی حاصل کر سکتا ہے تو پھر اسے اختیار ہے کہ کہیں سے لونڈی حاصل کر لے یا شادی کر لے۔ (صفحہ ۹)

(۴) چوتھی شرط یہ ہے کہ عورت کا حق مہر بھی ادا کر سکے اور اس کی کمائی کسب حلال سے ہو جس میں ظلم کا شائبہ تک نہ ہو۔ اگر ایسا نہ کر سکے تو شادی اس پر فرض نہیں کیونکہ حرام کی کمائی لوگوں پر ظلم، دھونس،

دھاندلی اور دھوکے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے ایک حرام (زنا) سے بچنے کے لئے دوسری محرکات کا ارتکاب کسی صورت جائز نہیں۔

ایسے شخص کو چاہیئے کہ وہ زنا سے بچنے کے لئے اپنے نفس سے جنگ کرے۔

(ایضاً۔ صفحہ ۶)

نکاح کا وجوب دوسرے فقہی مذاہب کے برعکس حنفی فقہ میں فرض سے ایک کم حکم کی اصطلاح "واجب" کی ہے۔ اور نکاح ایسے شخص کے لئے جسے شادی سے رغبت ہے اور اس کا اتنا اشتیاق ہے کہ اگر شادی نہ ہو سکی تو اس کے مرتکب زنا ہونے کا خدشہ ہے تو فرضیت والی شرائط کے ساتھ شادی واجب ہو جائے گی۔

نکاح کب سنّتِ مؤکدہ ہے ایسا شخص جسے نکاح سے رغبت بھی ہے اور وہ معتدل مزاج بھی ہے کہ اسے زنا میں پڑنے کا یقین یا خدشہ نہیں۔ وہ اگر اس حالت میں شادی ترک کر دیگا تو وہ تھوڑا سا گنہگار ہوگا جو واجب کے ترک سے کم گناہ ہوگا۔ اور بعض کا خیال ہے کہ واجب اور سنت مؤکدہ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ لیکن ان سب حالتوں میں کسب حلال سے خرچ، بیوی کو مہر کی ادائیگی اور اس سے مباشرت کی طاقت لازمی ہے۔ اس لئے اگر ان میں سے کسی شرط میں بھی کمی پائی جائے گی تو نہ یہ شادی واجب رہے گی نہ سنت۔ اسی طرح اگر وہ شادی کے ساتھ یہ نیت بھی کرلے کہ وہ اپنے نفس اور بیوی کو حرام سے بچانا چاہتا ہے تو پھر اس کو ثواب بھی حاصل ہوگا۔

حنفی فقہ میں شادی کب حرام ہوگی؟ جب کسی آدمی کو یہ یقین ہو جائے کہ شادی کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے اسے کسب حرام اور پھر اس کی وجہ سے لوگوں پر ظلم کرنا پڑے گا تو پھر اس کے لئے شادی حرام ہو جائے گی۔

مکروہ جب کسب حرام اور لوگوں پر ظلم کے ارتکاب کا یقین ہوگا تو ایسی کمائی سے شادی حرام ہوگی۔ لیکن اگر صرف کسب حرام کا خدشہ ہوگا تو پھر یہ شادی مکروہ ہوگی۔

(ایضاً۔ صفحہ ۷)

مباح ایسے شخص کو جسے شادی کی خواہش ہے لیکن اسے زنا میں پڑنے کا نہ کوئی یقین ہے اور نہ خدشہ، بلکہ وہ صرف اپنی شہوت کو پورا کرنے کے لئے شادی کرتا ہے تو

یہ اس کی مرضی پر منحصر ہے کہ چاہے وہ نکاح کرے اور چاہے نہ کرے۔ لیکن اگر وہ شادی کرلے اور اس کے ساتھ یہ نیت بھی کرلے کہ وہ زنا سے بچنا چاہتا ہے یا اولاد کی خواہش رکھتا ہے تو پھر یہ شادی مباح سے سنت بن جائے گی۔ گویا شادی کے مباح اور سنت ہونے میں صرف نیت کے ہونے یا نہ ہونے کا فرق ہے۔ (صفحہ ۷)

شافعی مذہب

امام شافعی کے نزدیک نکاح سرے سے اصولاً مباح ہے۔ یعنی اس کا کرنا یا نہ کرنا انسان کی مرضی پر منحصر ہے۔ پس جو شخص لذت کے لئے نکاح کرنا چاہے تو یہ اس کے لئے مباح ہے۔ اور اگر وہ اس کے ساتھ پاک دامنی اور حصول اولاد کی نیت بھی کرلے گا تو پھر شادی مستحب ہو جائے گی۔ اور جب کسی حرام چیز سے بچنے کے لئے شادی کی جائے گی تو پھر یہ فرض ہوگی۔ مثلاً کوئی فاجر مرد کسی عورت کا پیچھا کئے ہوئے ہے اور شادی کے بغیر وہ اسے روک نہیں سکتی۔ تو اس پر واجب ہے کہ وہ کسی مرد سے شادی کرلے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۷)

مکروہ کب ہے

لیکن جب کوئی شخص حقوق زوجیت پورے نہ کرسکے تو اس کے لئے شادی مکروہ ہے۔ اسی طرح وہ عورت جسے نکاح سے کوئی رغبت نہیں اور نہ ہی اسے نکاح کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اور اسے بدکاری کا بھی خوف نہیں تو ایسی عورت کے لئے شادی کرنا مکروہ ہے۔

اسی طرح وہ مرد جسے نکاح سے کوئی رغبت نہیں اور اسے بیوی کا مہر ادا کرنے پر بھی قدرت نہیں اور نہ ہی وہ اس کے اخراجات پورے کرسکتا ہے۔ تو اس کے لئے شادی کرنا مکروہ ہے۔

الحنابلۃ

مرد یا عورت کو یہ خدشہ ہو کہ کہیں وہ شادی کے بغیر زنا کے مرتکب نہ ہو جائیں تو ان پر نکاح کرنا فرض ہے۔ اور اس صورت میں اس امر میں کوئی فرق نہیں کہ چاہے وہ نفقہ پر قادر ہوں یا نہ ہوں پس جس وقت انہیں قدرت ہو تو وہ حرام سے بچنے کے لئے شادی کرلیں۔ اور اللہ کی اعانت سے حلال کی کمائی کی کوشش کریں۔

حرمتِ نکاح ضرورت کے بغیر دارالحرب میں نکاح حرام ہوگا۔ اگر وہ قیدی ہے تو ہر حال میں اس پر نکاح مباح ہے۔ یعنی چاہے کرے یا نہ کرے۔

سُنّت اگر کسی مرد یا عورت کو نکاح میں رغبت ہو، لیکن اسے زنا میں پڑنے کا کوئی خدشہ نہیں تو اس کے لئے نکاح سنت ہے اور نفلی عبادت سے افضل ہے کیونکہ اس میں زوجین کی پاک دامنی ہے اور اولاد کی امید ہے کہ جس سے امت میں اضافہ ہوگا۔

مباح اور شادی اس شخص کے لئے مباح ہوگی جسے اس کی رغبت نہیں۔ جیسے بڑی عمر کا کوئی شخص یا مقطوع الذکر۔ لیکن ایسا شخص اگر نکاح کرنا چاہے تو اسی صورت میں کہ بیوی کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ یا اس کے اخلاق کے خراب ہونے کا خدشہ نہ ہو۔ ایسا ہو تو پھر یہ شادی حرام ہو جائے گی۔ (صفحہ ۸)

یہ رہا کتاب الفقہ کے متعلقہ باب کا ترجمہ

امام غزالیؒ نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف احیاء العلوم میں ان سلف صالحین کے اقوال نقل کئے ہیں جنہوں نے ساری عمر شادی نہ کی۔ اور یہ بھی بتایا کہ ان کے لئے وہ کیا جواز پیش کرتے تھے۔ ان میں سے چند ایک مشہور ہستیوں کے اقوال درج ذیل ہیں۔

(۱) وکذالک اعتذر ابراھیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ وقال لا اغر امرأۃً بنفسی ولا حاجۃ لی فیھن۔

اسی طرح ابراہیم بن ادہمؒ نے بھی شادی سے اپنی معذوری ظاہر کی کہ میں اپنے نفس کی خاطر ایک عورت کو دھوکا دینا نہیں چاہتا اور مجھے اس کی خواہش بھی نہیں ہے۔

(احیاء العلوم۔ مطبوعہ مصر۔ جلد ۲۔ صفحہ ۲۳)

(۲) وکذالک اعتذر بشرؒ وقال یمنعنی من النکاح قولہ تعالیٰ ولھن مثل الذی علیھن وکان یقول لو کنت اعول دجاجۃ لخفت ان اصیر جلاداً علی الجسد (ایضاً)

اسی طرح بشرؒ نے شادی سے معذرت میں یہ دلیل دی کہ مجھے نکاح کرنے سے اللہ تعالیٰ کا یہ حکم روکتا ہے کہ ان عورتوں کے حقوق بھی ویسے ہی ہیں جیسے ان کی ذمہ داریاں اور فرمایا کرتے تھے کہ (بال بچوں کی کفالت تو ایک طرف) اگر مجھے ایک مرغی بھی پالنی پڑے تو اس ذمہ داری کو پورا نہ کرنے کا جو گناہ مجھ پر ہوگا اس پر میں اس گناہ کو ترجیح دوں گا جس کا میں کسی بیل پر

کھڑے ہوکر راہ گذروں کو قتل کرنے سے مرتکب ہو نگا۔

(۳) وکذالک اعتذر بعضھم من المتزوج و قال انا مبتلی بنفسی وکیف اضمن الیھا نفسا اخری۔ (ایضاً)

اسلاف میں سے بعض نے معذوری ظاہر کی شادی سے۔ اور انہوں نے یہ کہا کہ میں خود مصیبت میں مبتلا ہوں۔ ایک اور کو اس میں کیسے شامل کروں۔ (ایضاً)

(۴) امام ابن سالمؒ سے جب شادی کے متعلق پوچھا گیا۔ تو آپ نے یہ فرمایا کہ اگر کوئی شخص ضبطِ نفس سے کام لے سکتا ہے تو اس کے لئے شادی نہ کرنا ہی افضل ہے۔ (ایضاً صفحہ ۴۳)

مایوس مریضوں کیلئے سنہری موقع

حکیم شمس الرحمٰن خان۔ فاضل الطب والجراحت (دہلی) بی۔ آئی۔ ایم۔ ایس۔

۳۳ سالہ تجربہ۔

برادر شفاء الملک حکیم رشید احمد خان مبیّ۔ و حکیم ذکی احمد خاں جید پریس دہلی والے

دق۔ ذیابیطس۔ گنٹھیا۔ مرگی۔ دمہ۔ بالخورہ۔ بلڈ پریشر۔ فالج۔ بواسیر۔ پتھری۔ پیچش۔ یرقان۔ داد چنبل۔ ایگزیما کے علاوہ مردوں عورتوں کے پوشیدہ امراض خصوصاً بانجھ پن کا خاص معالج بچوں کے علاج کے خصوصی ماہر!

اوقاتِ مطب:۔ گرما۔ صبح ۷½ سے ۱۲ ؛ شام۔ ۵ بجے سے ۸½ بجے
سرما۔ صبح ۸½ سے ۱۲ ؛ شام۔ ۵ بجے سے ۸ بجے

پتہ

مین بازار۔ مصطفیٰ آباد۔ لاہور ۱۵

وسیم اللہ، ایم۔ اے

فقہی اصطلاحات

آپ صبح سے شام تک اس قسم کے الفاظ سنتے ہوں گے کہ ــــ یہ فرض ہے، یہ واجب، یہ سنت ہے، یہ مستحب، یا یہ حرام ہے، یہ مکروہ ــــ کیا آپ نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ ان الفاظ کا مفہوم کیا ہے، اور ان میں فرق کیا ہے؟ ہم نے یہ سوال اٹھایا اس لئے ہے کہ جب کسی بات کے متعلق یہ سن لیا جائے کہ (مثلاً) یہ فرض ہے یا واجب، یا ایسا کرنا سنت ہے، تو اس سے اس بات کے متعلق ایک خاص تصور ذہن میں پیدا ہو جاتا ہے اور ایسا نہ کرنے سے انسان یوں محسوس کرنے لگ جاتا ہے کہ اگر وہ دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہو گیا، تو بھی (کم از کم) اس سے کوئی سنگین جرم سرزد ہو گیا ہے جس سے اس کی روح پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔

اس کی وضاحت کے لئے ہم قربانی کے مسئلہ کی مثال پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں عامۃ الناس کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ قربانی کے واجب ہونے پر اجماعِ امت ہے۔[1] یعنی امتِ مسلمہ کے تمام اہلِ علم یا کم از کم ان کی اکثریت کے نزدیک یہ ہر صاحبِ نصاب مسلمان پر واجب ہے کیونکہ سنت ہے اور سنت بھی مؤکدہ۔ اب "سنت مؤکدہ" کے الفاظ سن کر اس کی اہمیت بڑی نمایاں ہو جاتی ہے۔ لیکن دیکھئے کہ ان تمام ائمہ کے نزدیک (جن میں امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ بن حنبل شامل ہیں) قربانی کا شرعی حکم کیا ہے؟[2]

ان الاضحیة سنة عین مؤکدة ... یثاب فاعلها ولا یعاقب تارکها

(قربانی سنت عین مؤکدہ ہے، کرنے والا ثواب کا حقدار ہوگا اور نہ کرنے والے پر کوئی شرعی گرفت نہیں)

---

[1] ماہنامہ "میثاق" لاہور ستمبر ۱۹۶۶ء صفحہ ۸۰

[2] الفقہ علی المذاہب الاربعة۔ جلد ۱ صفحہ ۶۴۳

لیئے اگر کوئی مسلمان ثواب حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ اس پر عمل کرے کیونکہ یہ سنت ہے، لیکن کسی کو اس پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ ہی ایسا کرنے والے پر شریعت کی طرف سے کوئی مواخذہ ہوگا۔ لیکن سنت کی اس فقہی تعریف کو نظر انداز کرکے یہاں ہر صاحبِ نصاب کو قربانی دینے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ صرف اس اصطلاح کے معمولی فرق سے کروڑوں روپے کے اخراجات کا فرق پڑ جاتا ہے۔ اگر لوگوں کو ان فقہی اصطلاحات کا صحیح علم ہو، تو وہ ہر عمل کا صحیح مقام متعین کر سکتے ہیں۔ اس لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ ائمہ اربعہ نے جو فقہی اصطلاحات متعین کی ہیں، ان کا ترجمہ عوام تک پہنچا دیا جائے۔ یہ اصطلاحات فقہ کی مشہور کتاب ' الفقہ علی المذاہب الاربعہ جلد اول ' کے آخر میں بڑی مناسب ترتیب سے دی گئی ہیں۔ ہم وہاں سے ان کا ترجمہ کرتے ہیں۔

اس مقام پر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ یہ اصطلاحات قرآن کی نہیں، فقہ کی ہیں۔ قرآن میں تو اوامر اور نواہی ہیں۔ یعنی کسی کام کے کرنے کا حکم یا اس سے باز رہنے کی تاکید۔ اوامر کے سلسلہ میں فرض، واجب، سنت، مستحب وغیرہ کی تفریق اور ان کے لئے یہ اصطلاحات، ائمہ فقہ کی متعین کردہ ہیں۔ اب ان اصطلاحات کا ترجمہ دیکھئے:۔

شافعی فقہ کی اصطلاحات

فرض اور واجب:۔ شافعی مذہب میں واجب اور فرض کی اصطلاحات ایک ہی مفہوم رکھتی ہیں اور ان کا شرعی حکم یہ ہے کہ ان پر عمل کرنے والا ثواب کا مستحق ہوتا ہے اور جو انہیں ترک کر دے، اس پر شرعی سزا لازم ہوگی۔ مثلاً فرض نماز کو پورا کرنے والا ثواب کا حقدار ہوگا اور اسے ترک کرنے والے کو جہنم کا عذاب دیا جائے گا۔ اسی طرح تمام دوسرے فرائض میں بھی۔ ہاں بعض اوقات فرض اور واجب کی اصطلاحات میں فرق کیا جاتا ہے اور وہ عام طور پر حج کے احکام ہیں۔ وہاں فرض سے وہ احکام مراد لئے جاتے ہیں جن کی عدم تعمیل کی وجہ سے حج باطل ہو جائے اور واجب وہ احکام ہیں کہ اگر رہ بھی جائیں تو فدیہ دینے سے ان کی تلافی ہو جاتی ہے۔

حرام:۔ حرام وہ ہے جس کے ارتکاب پر مرتکب کو سزا دی جائے اور اس سے بچنے پر وہ مستحق ثواب ہوگا۔ اور جب کوئی ایسا شخص جس کے لئے حرام سے ہر حالت میں بچنا لازمی ہے، اس میں پڑ جائے گا تو اسے جہنم کا عذاب ہوگا۔

مکروہ:۔ مکروہ وہ ہے جس کا ترک کرنا فرض تو نہ ہو لیکن مستحسن ضرور ہو۔ اس لئے جب کوئی مسلمان اس کا ارتکاب کر لے گا تو اسے عذاب تو کوئی نہیں ہوگا، ہاں جب اسے ترک کرے گا، تو ضرور

ثواب کا مستحق ہوگا۔

سنت، مندوب، مستحب، تطوع ـــ یہ تمام اصطلاحات شافعیہ کے نزدیک مترادف مفہوم رکھتی ہیں۔ یعنی ان پر عمل کرنا تو مطلوب و مستحسن ہے لیکن لازمی اور فرض نہیں۔ اس لئے ان پر عمل کرنے والا ثواب کا حقدار ہوگا۔ لیکن اگر کوئی ان کو ترک کر دے گا تو ان پر شریعت کی طرف سے کوئی پکڑ نہ ہوگی۔

شافعیہ کے نزدیک سنت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک سنت عین، جس پر ہر مومن انفرادی طور پر عمل کرے جیسا کہ فرائض، مثلاً نماز، روزہ انفرادی طور پر لازم ہوتے ہیں ـــ سنت کی دوسری قسم سنت کفایہ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب جماعت میں سے کوئی ایک بھی اس پر عمل کر لے تو بقیہ سے وہ ساقط ہو جائے جیسا کہ جماعت میں سے ایک آدمی سلام کی ابتدا کرے، یا جب بہت سے کھانے والے ہوں تو ان میں سے ایک کھانے پر بسم اللہ پڑھ لے، یا بہت سے لوگوں کی موجودگی میں ایک آدمی کا چھینک کا جواب دینا۔ پس ان تمام امور میں جب جماعت میں سے ایک آدمی کر لے گا تو تمام جماعت سے سنت کا مطالبہ دور ہو جائیگا۔ لیکن ان میں سے ثواب کے لئے صرف وہی ایک مخصوص ہوگا۔ اسی طرح واجب کی بھی دو قسمیں ہیں ـــ واجب عین، جو ہر شخص پر انفرادی طور پر لازم ہو جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔ اور دوسرا واجب کفایہ۔ اور وہ یہ ہے کہ جب جماعت میں سے کوئی ایک بھی اس پر عمل کرے، تو باقیوں سے ساقط ہو جائے۔ جیسا کہ نماز جنازہ میں شرکت اور سلام کا جواب دینا وغیرہ۔

مالکی فقہ کی اصطلاحات

واجب:۔ مالکیہ کے نزدیک واجب وہ ہے جس پر عمل کرنے سے ثواب ہو اور اس کے ترک کرنے پر سزا و عذاب ہو۔ اسے فرض اور لازم بھی کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ فرض نمازیں۔ ہاں حج کے احکام میں فرض اور واجب میں کچھ فرق کیا جاتا ہے۔ فرض وہ شرعی حکم ہے جس کے ترک کرنے سے سرے سے حج ہی باطل ہو جاتے اور واجب وہ ہے جس کی کمی فدیہ دے کر پوری کی جا سکے۔

مالکیہ کے نزدیک بھی فرض کی دو قسمیں ہیں۔ فرض عین وہ ہے جس کا ہر مکلف مسلمان سے مطالبہ کیا جائے اور فرض کفایہ وہ ہے کہ جب کوئی ایک شخص بھی اس پر عمل کرے تو بقیہ لوگوں سے ساقط ہو جائے۔ جیسا کہ نماز جنازہ اور میت کا کفن دفن وغیرہ۔

حرام:۔ حرام یہ ہے کہ جس کے ارتکاب پر سزا ہو اور اس کا ترک کرنا مستحسن ہو۔ اس کے لئے دوسرے اصطلاحی نام، محظور، معصیت وغیرہ بھی ہیں۔ اس کی مثال شراب نوشی وغیرہ ہیں۔

سُنّت :- سنت وہ ہے جس کی حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمائش کی ہو اور پھر اس کی تاکید کی ہو اور اس کی بڑی قدر بیان کی ہو اور اُسے پوری جماعت کے سامنے کیا ہو۔ اور کوئی دلیل اُسکے واجب ہونے پر دلالت نہ کرے۔ جب کوئی مسلمان اس پر عمل کرے گا تو وہ ثواب کا مستحق ہوگا۔ اور جب اُسے ترک کریگا تو اُسے کوئی پکڑ نہ ہوگی اور اس کی مثال وتر اور عیدین کی نماز ہے۔

مندُوب :- جسے حضورؐ نے کرنے کو تو کہا ہو لیکن زیادہ زور نہ دیا ہو اور معاملہ کو ہلکا سمجھا ہو۔ پس جب کوئی مسلمان اس پر عمل کرے گا تو اُسے ثواب ملے گا اور جب کوئی ترک کرے گا تو اس سے شریعت میں کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔ جیسا کہ نماز ظہر کے پہلے کی چار رکعتیں وغیرہ۔

مکرُوہ :- مکروہ وہ چیز ہے جس سے شارع علیہ السلام نے منع تو کیا ہو لیکن زیادہ زور نہ دیا ہو۔ پس جب کوئی اس میں پڑجائے گا تو اُسے شریعت کی طرف سے کوئی سزا تو نہ ہوگی۔ ہاں اُسے خلافِ اَولیٰ کہیں گے۔ جیسے تبلیغ کے کام کو ترک کر دینا یا نماز عصر کے بعد نفل وغیرہ پڑھنا۔

مباح :- یہ ہے کہ جس کا شارع علیہ السلام نے نہ تو کرنیکا مطالبہ کیا ہو اور نہ ہی اس سے منع کیا ہو۔ پس ایک مکلف مسلمان اسکے کرنے اور ترک کرنے میں مختار ہے۔

حنبلی فقہ کی اِصطلاحات

فرض :- ان کے نزدیک بھی فرض کی وہی تعریف ہے جو اوپر گذر چکی ہے۔ حنابلہ فرض کو رکن بھی کہتے ہیں۔

واجب :- یہ بھی فرض کی طرح ہے۔ مگر حج میں فرض وہ ہے جس کے رہ جانے سے حج باطل ہو جائے۔ اور واجب وہ ہے جس کے رہ جانے پر فدیہ دے کر اس کی تلافی کر لی جائے۔ اسی طرح نماز کے بعض اعمال میں واجب اور فرض میں کچھ فرق کیا جاتا ہے۔ حنابلہ نے نماز کے کچھ واجبات گنائے ہیں جن کے عمداً ترک کرنے سے نماز باطل ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر بھول چوک سے کوئی کمی رہ جائے تو اُسے سجدہ سہو کے ذریعہ پورا کر لیا جاتا ہے۔ فرض میں یہ کمی سجدہ سہو سے پوری نہیں ہو سکتی بلکہ نماز ہی باطل ہو جاتی ہے دوسرے ائمہ کی طرح ان کے نزدیک بھی فرض کی دو ہی قسمیں ہیں۔ فرض عین اور فرض کفایہ۔ سنت مندوب اور مستحب ان کے نزدیک مترادف اصطلاحیں ہیں۔ ان تمام کا ایک ہی مفہوم ہے۔ ان پر عمل کرنے سے ثواب ملیگا اور ترک کرنے پر کوئی گرفت نہیں ہوگی۔

حرام :- وہ ہے جس کے ترک کرنے پر ثواب ہو اور اسکے ارتکاب پر سزا اور عتاب ہو۔

حلال: یہ حرام کی ضد ہے اور اس میں واجب، مندوب اور مکروہ سب شامل ہیں۔ پس واجب حلال کے ترک پر گناہگار بھی ہوگا اور سزا بھی ہوگی جبکہ دوسری حلال چیزوں کے کرنے یا ترک کرنے پر گناہگار نہ ہوگا۔

باطل: وہ ہے جس سے ذمہ پورا نہ ہو سکے۔ مثلاً جب نماز کے ارکان میں سے کوئی رکن کم ہو گیا تو نماز باطل ہو جائے گی۔ اور وہ اس شخص کے ذمہ رہے گی یہاں تک کہ وہ اسے دوبارہ ادا نہ کر لے۔

صحیح: وہ ہے جس سے ذمہ داری پوری ہو۔

حنفی فقہ کی اصطلاحات

فرض: حنفیہ کے نزدیک فرض وہ ہے جو دلیل قطعی سے ثابت ہو اور اس میں کوئی شبہ نہ ہو جیسے کہ پانچ نمازیں اور زکوٰۃ اور روزہ اور حج اور اللہ تعالےٰ پر ایمان۔ فرض کا شرعی حکم ہے کہ وہ اعتقادی اور عملی دونوں طرح سے لازم ہو۔ پس جب کوئی اس کا انکار کرے تو وہ کافر ہوگا اور جب اسے ترک کرے گا یعنے صرف عمل نہ کرے گا تو وہ شخص فاسق شمار ہوگا۔

واجب: حنفیہ کے نزدیک یہ فرض سے کمتر درجہ میں ہے اور جو ایسی دلیل سے ثابت ہو جس میں شبہ ہو۔ اس کا شرعی حکم یہ ہے کہ یہ عملاً تو لازمی ہو اور اعتقاداً نہ ہو۔ اس کا منکر شبہ کی گنجائش کی وجہ سے کافر نہ ہوگا اور اس کا تارک فرض سے کمتر درجہ کا گناہگار ہوگا کیونکہ جو فرائض کا تارک ہوگا اسے تو آگ کا عذاب دیا جائے گا لیکن جو واجب ترک کرے گا تو تحقیق یہ ہے کہ اسے آگ کا عذاب تو نہ ہوگا وہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے محروم ہوگا۔

سنّت: احناف کے نزدیک سنت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک سنت مؤکدہ، اور یہ بالکل واجب کے حکم میں ہے۔ پس اس کا ترک کرنے والا فرض سے کم درجہ کا گناہگار ہوگا۔ اور جب یہ نماز میں سہواً رہ جائے تو سجدہ سہو سے اس کی تلافی ہو جاتی ہے، جیسا کہ واجب میں۔ اور بعض واجب احکام دوسرے واجب احکام سے زیادہ مؤکد ہیں۔ مثلاً سجدہ تلاوت صدقہ فطر سے زیادہ واجب ہے۔ اور ان دونوں کا وجوب قربانی سے زیادہ مؤکد ہے۔ دوسری قسم سنت غیر مؤکدہ ہے اور یہ مندوب اور مستحب ہے۔

حرام: حرام فرض کے مقابل ہے۔ اس کے مرتکب کو آگ کا عذاب ہوگا۔ اور بچنے والا مستحق ثواب ہوتا ہے۔

مکروہ تحریمی: مکروہ تحریمی وہ ہے جو حرام سے زیادہ قریب ہو اور واجب اور سنت مؤکدہ کے مقابل ہو۔

مکروہ تنزیہی :- مکروہ تنزیہی یہ ہے کہ جس کے ارتکاب پر کوئی شرعی مواخذہ نہ ہو اور اس پر عمل کرنے سے تھوڑا سا ثواب ہے۔ اور یہ سنت غیر مؤکدہ کے مقابل ہے۔

(الفقہ علی المذاہب الاربعۃ۔ جلد اول صفحہ ۱۶)

طلوعِ اسلام

فقہ کی یہ اصطلاحات درحقیقت کسی زمانے کی اسلامی حکومت کے احکام و قوانین کی مختلف حیثیتوں کی نمائندہ تھیں۔ مثلاً آج بھی آپ دیکھئے۔ حکومت کی طرف سے نافذ کردہ احکام و قوانین کی مختلف نوعیتیں ہوتی ہیں۔ "بائیں طرف چلو" بھی قانون ہے۔ اور "حکومت کے خلاف بغاوت نہ کرو" بھی قانون ہے۔ اسی طرح "انکم ٹیکس ادا کرو" بھی ایک حکم ہے اور "وار فنڈ میں چندہ دو" بھی ایک طرح کا حکم۔ ان کی نوعیتوں کا فرق بھی ظاہر ہے۔ کسی زمانے کی اسلامی حکومت میں احکام و قوانین کی نوعیت کے فرق کے لئے اس قسم کی فقہی اصطلاحات وجود میں آئی تھیں۔ اب وہ حکومت تو باقی نہیں رہی لیکن یہ اصطلاحات بدستور چلی آرہی ہیں۔ اب ان کا نفاذ مولوی صاحبان کے فتوے کی شکل میں ہوتا ہے جس کی عملی حیثیت کا ہر ایک کو علم ہے۔ وہ اپنے حکم یا فتویٰ کی خلاف ورزی کرنے والوں کو بس اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ کل قیامت کو دیکھنا، تمہارے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ لیکن جب یہی اصطلاحات، حکومت کے قوانین کی حیثیت سے نافذ تھیں۔ ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کے مواخذہ کو قیامت پر ملتوی نہیں کیا جاتا تھا۔ عدالت فوراً فیصلہ کر دیتی تھی۔

اب بھی جب اور جہاں اسلامی حکومت قائم ہوگی اس کے قوانین کی مختلف حیثیتیں ہوں گی اور ان کی تعبیر کے لئے لامحالہ قانونی اصطلاحات بھی ہوں گی۔

پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

لاہور میں محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم ہر اتوار کی صبح ۸½ بجے ہوتا ہے۔

مستورات کے لئے پردہ کا انتظام ہے۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام۔

خورشید عالم

عربوں کا عالمی کردار

عرب بھی ترکوں کی طرح تاریخ کا افسانوی سا کردار بن گئے ہیں۔ ان کا عروج اچانک اور حیران کن تھا، اور اس کے نتائج وقت گذرنے کے ساتھ نمایاں تر اور پائندہ تر ہوتے گئے۔ جزیرۃ العرب سے نکل کر عرب افریقہ اور ایشیا میں پھیل گئے۔ یورپ انکے زیرِ نگین ہوتے ہوتے رہا۔ حالات نے ایسا باگ پر ہاتھ رکھا کہ ان کے قدم رُک گئے۔ وہ ہسپانیہ تک محدود ہو کر رہ گئے لیکن وہاں انہوں نے تہذیب و تمدن کی ایسی شمع روشن کی کہ یورپ بقعۂ نور بن گیا۔ عربوں نے تاریخِ انسانیت کا تاریک دور ختم کر کے روشن اور جدید دور کا آغاز کیا۔ ان کی آمد سے پہلے فکرِ انسانی نے جو کاوش کر رکھی تھی اور مختلف علوم میں جو ترقی ہو چکی تھی وہ جہالت کی ظلمت میں اس حد تک نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی کہ بازیافت کا امکان نظر نہیں آتا تھا۔ عربوں نے ایسی جوت جگائی کہ ظلمت چھٹ گئی اور انسان کی کاوش و ہنرمندی کی کھلی کتاب سامنے آ گئی۔ انہوں نے جملہ علوم کو تازگی اور زندگی بخشی اور انہیں انسان کے قدم بہ قدم چلایا۔ ان کے صدقے میں ظلمت، جہالت اور پسماندگی میں کھوتے ہوئے یورپ نے علم و ہنر کی روشنی دیکھی اور وہ زندگی کی بے قابو تڑپ محسوس کرنے لگا۔ یورپ کی مٹی میں عرب تہذیب و تمدن کا بیج بو کر صدیوں کی آبیاری سے اسے تناور درخت نہ بنا دیتے تو اس خطۂ ارض کا تاریخ میں شاید ہی کوئی کردار اور حصہ ہوتا اور اقوامِ عالم اس کے عہدِ اس کے عروج اور اسکے استعمار اور استحصال سے محفوظ رہتیں۔

عرب، رسولِ اکرمؐ اور قرآن کے اولین مخاطب تھے اور وہ اسلام ہی کے جاں بخش پیغام کی بدولت جزیرۃ العرب سے سیلاب بن کر بہ نکلے تھے اسلئے ان کے کردار کو اسلام کا کردار سمجھا جاتا رہا، اور سمجھا جاتا ہے۔ یہ ایک حد تک ہی درست ہے۔ ان کی فتوحات جغرافیائی بھی تھیں اور تصوراتی بھی۔ گو اسلام ایک انقلاب انگیز عنصر کی حیثیت سے عرب اور غیر عرب مسلمانوں کی زندگی میں مسلسل کارفرما رہا تاہم یہ حقیقت ہے کہ عربوں کو ساقیٔ ازل نے جو تنے بے دَرد و صاف عطا کی تھی اس میں قوموں قوموں، ملکوں ملکوں کا رنگ اس انداز

سے دکھائی دینے لگا کہ نہ رنگ ایک رہا اور نہ تھے صاف کو بے رنگ سمجھ چلے جانا ہر ایک کے بس کی بات رہی۔ نبوت تو حضورِ اقدسؐ کی ذات پر ختم ہوگئی لیکن خلافت بھی ملوکیت میں بدل گئی اور اس راستے خس و خاشاک کی ایسی سوغاتیں آئیں کہ مسلمانوں کی موجِ بے پاک دریا کے موتیوں سے خالی ہوتی گئی۔ صدیاں گذر گئیں، اسلام اور ملوکیت نبرد آزما ہے۔ جیسا قرآن میں ہر پیغمبر کی دعوتِ انقلاب کے ضمن میں دو طبقات کا بالعموم ذکر آیا ہے جو ہر دور میں اس کے خلاف صف آرا رہے ہیں۔ ایک سردارانِ قوم کا طبقہ اور دوسرا مذہبی پیشواؤں کا۔ دعوتِ انقلاب دونوں کے مفادات کے لئے مرگِ مفاجات ہوتی تھی۔ وہ بخوشی اپنے مفاداتِ خصوصی سے دستکش ہونے کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے اور ان کے تحفظ کے لئے کسی قسم کی مزاحمت سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ رسولِ اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ اس کی شاہد ہے کہ جب تک آپؐ نے براہِ راست تصادم سے ان عناصر کی سرکوبی نہیں کرلی، اسلام کا راستہ صاف نہیں ہوا۔ مفاد کے اس اشتراک نے تخت و مصلے کو ہمیشہ ایک دوسرے کا حلیف ہی بنائے رکھا ہے۔ اسی لئے مفاد پرست مذہبی پیشوا سلاطین کا دم بھرتے رہے ہیں۔ وہ مذہب کا سارا زور سلاطین کی پشت پناہی پر مرکوز کرکے اپنی عمر دراز کرنے کی فکر میں رہتے تھے۔ خدا کا نام لینے کے ان پیشہ ور دعویداروں نے پہلے انسان کو "خلیفۃ اللہ فی الارض" قرار دیا پھر بادشاہ کو "ظل اللہ" بنا دیا۔ بادشاہ خدا کا سایہ تو کیا ہوتے بادشاہوں کا سایہ ان مذہبی پیشواؤں کے سر پر سلامت رہا ـــ سلامت رہا ـــ تا آنکہ بقول اقبالؒ ـــ توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب! ـــ یہ سایہ پوری طرح چھٹا نہیں لیکن عالمِ عرب میں کئی طنابیں ٹوٹ چکی ہیں۔ باقی دنوں کی مہمان دکھائی دیتی ہیں۔ یہ طنابیں ٹوٹیں گی اور ملوکیت اور پیشوائیت کا تابوت بنیں گی۔ یہ جنازہ اٹھنے میں البتہ وقت لگے گا کیونکہ سلاطین کے علاوہ بھی اور ان سے بڑھ کر بھی امریکی سامراج مذہبی پیشوائیت کا سایۂ عاطفت بن گیا ہے۔ یہ جنازہ اٹھ چکے گا تو عربوں کا کردار کھل کر سامنے آئیگا اور سمجھا جا سکیگا۔

یورپ کا عہد شروع ہوا تو عرب ممالک ایک ایک کرکے استعمار کے جنگل میں پھنس گئے۔ عثمانی خلافت کے طفیل جو علاقے محفوظ رہ گئے تھے وہ پہلی جنگِ عظیم میں استعمار کے قبضے میں چلے گئے۔ عہدِ یورپ عربوں کے لئے کرب و ابتلا کا دور تھا۔ وہ چکی کے دو پاٹوں میں پس رہے تھے۔ ایک طرف خلافتِ عثمانیہ تھی جس کا سورج غروب ہو رہا تھا۔ دوسری طرف یورپی سامراج کی کڑکتی دوپہر تھی۔ انہیں ڈوبتے سورج کی خوشی بھی تھی اور غم بھی تھا۔ خوشی اسلئے کہ اسکی صبح ایسی بے نور ہو چکی تھی کہ اس کے دن پر بھی رات کا گمان ہوتا تھا۔ خود ترک کوشاں تھے کہ یہ سورج ڈوب جائے۔ یہ سورج ڈوب بھی رہا تھا اور اسے ڈوبنا بھی چاہیئے تھا لیکن صاف نظر آرہا تھا کہ یہ غروبِ آفتاب نہ پر سکون رات کی تمہید ہے نہ صبح روشن کی۔ یہ احساس

اُن کی خوشی کو غم میں بدل دینے کے لئے کافی تھا۔ ترکوں اور عربوں دونوں کے لئے یہ عجیب صورتِ حال تھی۔ ایک طرف زمانے کے تقاضے دونوں کے اندر سے زندگی کے دھارے ابھار رہے تھے تو دوسری طرف سامراج اس کوشش میں تھا کہ ان دھاروں میں ترکوں اور عربوں کی ٹکر ہو۔ اور وہ دونوں کو اپنے تصرف میں لے آئے۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد جمہوریت اور حقِ خود ارادیت کا خاص طور پر چرچا ہوا اور بعض چھوٹی چھوٹی قوموں تک کا جداگانہ تشخص تسلیم کر لیا گیا۔ ان خارجی عوامل میں خلافتِ عثمانیہ جیسی ہیئت برقرار نہیں رہ سکتی تھی جو داخلی عوامل کی وجہ سے بھی ایک جسدِ بیمار بن گئی تھی۔ اس ہیئت کا خاتمہ ترکوں اور عربوں کی آزادی کی صورت میں نکلنا چاہیئے تھا۔ ایسا ہوتا تو وہ دور شروع ہو جاتا جس کا ذکر اقبالؔ نے اپنے خطبات میں کیا ہے۔ یعنی مسلمان اقوام ایک سلطنت میں منسلک ہونے کی بجائے علیحدہ علیحدہ ہو کر آزاد ہو جائیں اور پھر آزادانہ طور پر بین الاسلامی تعاون کی صورت پیدا کریں۔ اقبالؔ کے نزدیک یہ تصور روایتی خلافت کا نہیں بلکہ "جمعیتِ اقوامِ مسلمہ" کا تھا۔ اقبالؔ نے بالغ نظری اور حقیقت پسندی سے کام لے کر جو بات کہی تھی اسے استعماری فریب کاری نے ایک اور ہی رنگ دے دیا۔ ایسا رنگ جسے آج تک غلط عینک لگا کر دیکھا جاتا ہے اور جسے اس کے اصلی نام سے یاد کرنے سے انکار کیا جاتا ہے۔

یہ تقاضائے وقت بھی تھا اور عربوں کا جائز حق بھی کہ وہ ترکوں سے آزاد ہوتے۔ یہ علیحدگی اور آزادی خوش آئند تھی۔ وقت آ گیا تھا کہ مسلمان اقوام ایک دوسرے کے تسلط سے آزاد ہو کر اپنے اپنے طور پر اپنے حسن میں ڈوب جائیں۔ وہ پہلے اپنی قوتیں پھر اندرونی توانائی کو بروئے کار لا کر مسلمان اقوام سے آزادانہ اور مساوی سطح پر اشتراک و تعاون کریں۔ یوں "جمعیتِ اقوامِ مسلمہ" کا تصور حقیقت بن جاتا اور ایسی پائندہ حقیقت بن جاتا کہ آج کسی سامراج اور کسی سامراج کے گماشتے کو ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھنے کی جرأت نہ ہوتی۔ عربوں کو آج بھی قومیت جیسے جائز موقف کی بنا پر جینے نہیں دیا جاتا اور اسے فتنہ قرار دے کر اس کا رشتہ یہودیوں سے ملایا جاتا ہے یہ سامراجی منطق ہے جسے مذہب کے اجارہ داروں نے اسلامی قرار دے رکھا ہے۔ عربوں میں ترکوں سے متعلق جو نفرت پیدا ہوئی اور جس کا مظاہرہ افسوسناک ہوا نیز ان میں جو افتراق آج بھی پایا جاتا ہے یہ عربوں کا پیدا کردہ نہیں۔ اپنے حقِ خود ارادیت کے استعمال سے عرب نہ اسلام سے ہٹے نہ انہوں نے اسلام کے منافی کوئی قدم اٹھایا۔ یہ سامراج کے نامۂ اعمال کی سیاہی ہے جو ان کے منہ پر مل دی گئی ہے۔ سامراج نے عربوں کے جائز تقاضے کا ناجائز فائدہ اٹھایا اور ان کے دلوں میں نفرت پیدا کر کے انہیں اپنی مطلب برآری کے لئے ترکوں سے لڑایا۔ حالات کی رفتار ایسی تیز تھی کہ عربوں کے لئے سامراجی چالوں کا سمجھنا آسان نہیں تھا۔ پھر سامراج نے سلاطین اور شیوخ کے مہرے تلاش کئے اور سیاست کی بازی کھیلی۔ یوں عالمِ عرب کے ٹکڑے کئے گئے اور

ان میں خرابی کی ایسی صورت رکھی گئی جس سے وہ مربوط نہ ہو سکیں۔ ٹکڑے کر کے اور یہ انتظام کرنے کے بعد کہ وہ پھر سے نہ جڑ جائیں سامراج نے اپنے کارندوں کے ذریعے عربوں کو عالم اسلام میں یوں بدنام کرنا شروع کر دیا کہ وہ ترکوں سے نفرت کرتے ہیں اور نسلی اعتبار سے اپنے آپ کو برگزیدہ قوم سمجھتے ہیں[1]۔ اس مفروضے پر عربوں کے خلاف وہ کچھ کہا گیا جو اسلام کے سامراجی دشمن کہلانا چاہتے تھے[2]۔ ذرا سوچا جائے تو بات صرف اس قدر تھی کہ خلافت عثمانیہ کا فرسودہ نظام ختم ہونا چاہیئے تھا اور عربوں کو آزاد ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن بات بنا یہ دی گئی کہ ترکوں نے اسلام چھوڑ دیا اور عرب مسلمان نہیں رہے۔ یوں عربوں کے اندر افتراق پیدا کیا گیا۔ عربوں کو ترکوں سے علیحدہ کیا گیا اور دونوں کو باقی دنیائے اسلام کی نظروں سے گرا کر یہ صورت حال پیدا کی گئی کہ مسلمان عالم آزاد ہو کر اشتراک و تعاون کی طرح نہ ڈال لیں۔ یہ "اسلامی" نقطۂ نگاہ سامراج کا پیدا کردہ تھا۔ اسی کی کارفرمائی ہم نے اپنے ہاں دیکھی جب بعض علماء اور نام نہاد اسلامی ذہن رکھنے والوں نے تحریک پاکستان کی مخالفت اس بنا پر کی کہ یہ تحریک اسلامی نہیں قومی اور وطنی ہے۔ اب بھی اسی بنا پر پاکستان میں خلفشار پیدا کیا جا رہا ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران اور اس کے کچھ بعد عربوں کے جداگانہ اور آزاد تشخص کے بروئے کار آنے میں جو رخنے پیدا کئے گئے عرب آج تک ان سے عہدہ برآ نہیں ہو سکے اور غیر عرب مسلمان بالعموم یہ نہیں سمجھ سکے کہ استعمار نے عربوں سے کیا کیا اور غیر عرب مسلمانوں کے سوتے سرچشموں کو کس حد تک گدلا کر دیا۔ یہ پس منظر آج واضح طور پر سامنے آجائے مگر تخت و مصلّے کی بارگاہوں سے جو فتوے صادر ہوتے ہیں ان پر استعمار کی مہریں لگی ہوتی ہیں۔ جب تک استعمار دخیل و کارفرما رہیگا سوچنے کے انداز اور کرنے کے پیمانے درست نہیں ہو سکتے۔ عرب عجیب کشمکش سے دوچار اس صورت حال سے نبرد آزما ہیں۔ وہ ایک ایک کر کے سیاسی طور پر تو آزاد ہو گئے ہیں لیکن انہیں ایسا ملوکیت کے حوالے کر دیا گیا کہ نہ ان کی آزادی مؤثر ہو سکی اور نہ وحدت ہی کی صورت پیدا ہو سکی سلاطین اور شیوخ کو سامنے لانے اور مسلط کرنے میں استعمار نے ایک تو یہ انتظام کر لیا کہ اس کی سیاسی پسپائی کے بعد اس کا اثر و دخل باقی رہے دوسرے یہ کہ جملہ عرب براہ آپس میں لڑتے جھگڑتے رہیں اور

---

[1] عربوں کی ترکوں سے نفرت کا رونا وہ بھی روتے نہیں شرماتے جو خود ترکوں کی انقلابی جدوجہد کو یہودی سازش قرار دیتے ہیں۔

[2] ہمارے ہاں عربوں کی ہمدردی کے ایسے دعویدار بھی ہیں جو انکی شکست پر تو آنسو بہاتے ہیں لیکن یہ کہتے نہ تھکتے ہیں نہ شرماتے ہیں کہ عربوں کو یہ سزا ملنی ہی چاہیئے تھی۔

اتحاد و یگانگت کا نام لیتے رہنے کے باوجود وحدت کو عملاً متشکل نہ ہونے دیں۔ اس سے عربوں کی جدوجہد کا نیا دور شروع ہوا یا ہونا چاہیئے تھا۔ اس دور کے تقاضے یہ تھے کہ سامراج کی کارفرمائی کو سمجھ کے اس کے خلاف محاذ قائم کیا جاتا اور اندرونی طور پر ان عناصر سے چھٹکارا حاصل کیا جاتا جو استعمار کا آلۂ کار بن جاتے ہیں۔ ان عناصر میں سرفہرست شاہان و شیوخ اور ان کے حواری تھے۔ عربوں میں ان عناصر کا کردار نمایاں طور پر قابلِ نفرین ہوگیا۔ عالم عرب میں جگہ جگہ تیل کے چشمے دریافت ہوئے تو یہ علاقے اضافوی حد تک دولت آفریں ہوگئے۔ یہ دولت بُری طرح ضائع ہوتی اور ہو رہی ہے۔ دولت کے دودھ کی ان بہتی نہروں کی بالائی استعماری ممالک لے جا رہے ہیں۔ دہی تیل نکالتے ہیں اور عالمی منڈیوں میں بیچتے ہیں۔ اس طرح انہوں نے نہ محض خود بے تحاشا دولت کمائی بلکہ عربی زندگی پر ایسے چھا گئے کہ اس میں نشوونما ناممکن نہیں تو بہت دشوار ہوگئی۔ جو دولت ان سے بچ رہی وہ سلاطین و شیوخ کے تصرف میں آگئی اور ان کے ذاتی عیش و عشرت میں ضائع ہوتی رہی اور ہو رہی ہے۔

اس خداداد اور روز افزوں دولت سے عامۃ الناس کو کوئی قابلِ ذکر فائدہ نہیں پہنچا۔ اس سے عربوں کا عجیب تصور سامنے آیا۔ ایک طرف شخصی تعیش کا اور دوسری طرف اجتماعی پسماندگی۔ در مفلوک الحالی کا۔ یہ عرب کا کردار نہ کبھی تھا نہ ہو سکتا ہے۔ یہ استعمار اور استحصال کی کرشمہ سازی ہے۔ لیکن اس کا سرچشمہ عربوں کی ذات میں دیکھنے کی کوشش کی گئی اور کی جا رہی ہے۔ آج عربوں کے خلاف جو تعصب غیروں کیا اپنوں تک میں پایا جاتا ہے وہ اسی کا نتیجہ ہے۔ ان دونوں قوتوں یعنی استعمار اور استحصال نے عربوں کو اپنے آپ میں نہیں آنے دیا اور ان کی جدوجہد کو نتیجہ خیز نہیں ہونے دیا۔ اسکے باوجود جو ہوا اور ہو رہا ہے، وہ حوصلہ افزا ہے۔ سیاسی آزادی کا دور دورہ ہوا تو ناممکن تھا کہ ان دو انتشار انگیز اور وحدت کش قوتوں کے خلاف کچھ نہ کیا جاتا۔ سب سے پہلے اور سب سے زیادہ جرأت مندانہ اقدام مصر نے کیا۔ مصر نے ملوکیت ہی کا خاتمہ نہیں کیا، بلکہ استعمار کے خلاف دلیرانہ اقدامات کی طرح ڈالی۔ ملوکیت کس حد تک مردود متصور ہو چکی تھی اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۵۲ء سے لے کر آج تک اسے پھر سے لانے کی کوئی کوشش نہیں ہوئی۔ محض ملوکیت کے خاتمے سے اندرونی استحصال ختم نہیں ہو جاتا۔ یہ اصل کام یعنی معاشرے کی تشکیلِ نو کا قدم اول ہے۔ گو مصر میں اصل کام سنجیدگی سے شروع نہیں ہوا تاہم اس قدم اول کے لئے ہی مصر کو خوب خوب سزا دی گئی ہے۔ یہ سزا استعمار نے دی۔ اس سزا کی طرح پہلی جنگِ عظیم کے دوران ہی ڈال دی گئی تھی جب فلسطین کے دروازے یہودیوں کے لئے کھول دیئے گئے اور یہودی وطن اور حکومت قائم کرنے کے لئے عیارانہ اور منظم اقدامات کئے جانے لگے۔ یہ حکومت ۱۹۴۸ء میں مسلط کر دی گئی اور ایک تلوار کی طرح عربوں کے سروں پر

لٹکا دی گئی۔

یہ تلوار بے نیام ہو کر پہلے بھی بے دریغ چل چکی تھی لیکن ۱۹۵۶ء میں جب مصر نے امریکی استعمار کی دھمکیوں میں آنے سے انکار کر دیا اور آزادانہ فیصلے کرنے پر اصرار کیا تو یہ تلوار پھر سے چمکنے تڑپنے لگی۔ اس کے قبضے پر اسرائیل ہی کا ہاتھ نہیں تھا، فرانس اور برطانیہ کا بھی تھا۔ اکیلے مصر پر تین طاقتوں نے حملہ کر دیا۔ عسکری طور پر مصر ان کا حریف تھا یا نہیں، بین الاقوامی میدان میں وہ ایسی سیاسی حیثیت حاصل کر چکا تھا کہ امریکہ مصر کے حملہ آوروں کے عزائم سے پوری ہمدردی رکھنے کے باوجود ان کا ہاتھ روکنے پر مجبور ہو گیا۔ اپنی آزادروی اور جرأت کردار کی بنا پر مصر شکست سے بھی بچ گیا اور نہر سویز پر بھی اپنی ملکیت برقرار رکھنے میں کامیاب رہا۔ امریکہ نے البتہ اسرائیل کو خلیج عقبہ کی اہم بندرگاہ ایلات تک پہنچا دیا۔ یہ اس بھرپور جارحیت کی تمہید تھی جس کا مظاہرہ جون ۱۹۶۷ء میں ہوا۔ اس جارحیت سے عربوں کو بڑی سزا ملی۔ بیگانے تو بیگانے تھے نام نہاد اپنوں نے بھی عربوں کی شکست کا خوب چرچا کیا اور مصر اور صدر ناصر کے خلاف دل کی بھڑاس نکالی جو باتیں یہودیوں کو اپنی طرف سے مصر اور صدر ناصر کے خلاف کہنی چاہئیں تھیں وہ انہوں نے اپنی طرف سے بلا سوچے سمجھے کیں اور کرتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ اسلام کا دم بھرنے والے اور مصر سے ہمدردی جتانے والے دانستہ نہیں تو نادانستہ طور پر استعمار کے آلۂ کار بنے ہوئے ہیں لیکن نہیں سوچتے کہ وہ کس طرح دشمنانِ عرب و اسلام کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں۔ مصر کو ہزار سزا دینے کا سوچا جائے مگر اس سے انکار مشکل ہے کہ عالمِ عرب میں جو رَو پیدا ہو چکی ہے وہ کسی کے روکے نہیں رُکے گی۔ سلاطین و شیوخ کوئی دم کے مہمان ہیں۔ انہیں جانا بھی چاہیئے اور جا کے ہی رہیں گے۔ ان کے جانے سے ہی فوجی اور ذہنی اڈے ختم ہو سکیں گے جو استعمار نے قائم کر رکھے ہیں اور جو استعمار کی شکار قوموں کے کردار کو اصل رنگ میں ظاہر ہونے سے روکتے ہیں۔ اس کے بعد ہی عرب اپنے آپ میں آئیں گے اور وہ خلافِ استعمار اور خلافِ استحصال کردار ادا کر سکیں گے جس کے ادا کرنے کے لئے وہ پہلو بدل بدل کر کوشش کرتے چلے آ رہے ہیں لیکن جن کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلائی جا رہی ہیں۔

عرب اپنی کوششوں میں کامیاب دکھائی نہیں دے رہے تو یہ دیکھنے والوں کی سطح بینی بھی ہے اور ان کا فسادِ نظر بھی۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، عربوں کی ہر بات میں کیڑے نکالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ تقاضائے استعمار یہی ہے کہ عربوں کو غلط رنگ میں پیش کیا جائے اور ان کی خامیوں اور ناکامیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جائے تاکہ ان کے متعلق غلط فہمیاں پھیلا کر ان کی رفتارِ کار کو سست کیا جائے۔ اور ان کو باہر سے مدد تو کیا ہمدردی تک حاصل نہ ہو۔ دوسری جنگِ عظیم میں یورپ اور جنوب مشرقی ایشیا

سے افراتفری سے بھاگتے اور بھاگتے چلے جانے والی مغربی طاقتوں سے بہتر کون جان سکتا ہے کہ ایک محاذ سے پسپا ہونا جنگ میں شکست کھانے کے مترادف نہیں ہو سکتا۔ نیز شکست بھی وقتی ہو سکتی ہے۔ ۱۹۴۰ء میں کوئی بہت بڑا خوش فہم ہی یہ کہہ سکتا تھا کہ جرمنی کے سیلابِ بلا میں انگلستان ڈوب نہیں جائیگا اور اس پر قابو پا لیگا۔ یورپ سے جرمنی کے حریفوں کی پسپائی ان کی شکست کا پیش خیمہ بھی ہو سکتی تھی اور فتح کی تمہید بھی۔ اسی طرح عربوں کی شکست کو حرفِ آخر نہیں کہا جا سکتا۔ دشمنانِ عرب ـــ وہ استعماری عناصر ہوں یا ان کے اسلام کا دم بھرنے والے کرائے دار ـــ اس شکست کا جتنا چاہیں کریں، وہ تاریخ کے دھارے کو دائماً روک نہیں سکتے۔ ذرا کان لگا کے سنا جائے تو ـــ اب بھی درختِ طور سے آتی ہے بانگِ لاتخف!

جو صورتِ حال ہمارے سامنے ہے وہ حوصلہ شکن نہیں۔ عرب ملوکیت کی لعنت سے نجات حاصل کرتے جا رہے ہیں۔ اب تک یہ فوجی انقلاب ہی سے ممکن ہو سکا ہے۔ فوج کے یہ اقدامات اس جذبۂ بغاوت کے مظہر ہیں جو عالمِ عرب میں قدرتی طور پر ملوکیت کے خلاف ابھر آیا ہے۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ یہ اقدامات ایک حد تک ہی انقلابی ہیں۔ ان سے ملوکیت کی بساط یقیناً نہ کی جا رہی ہے، لیکن اس اعتبار سے یہ اقدامات جزوی یا منفی ہیں کہ فوج اپنے مزاج و منصبِ خصوصی کی بنا پر وہ انقلابی قیادت مہیا نہیں کر سکی جو ملوکیت کے مفاسد کو دور کر کے معاشرے کو نئے سرے سے متشکل کرنے کی ذمہ دار ہو تاکہ قیادت عوام کے اندر سے ابھرے اور عوام ہی کی بہبود کی خاطر سرگرمِ عمل ہو۔ لیکن فوج نے جو راستہ تراشا ہے وہ آگے چلنے لگا ہے۔ اسکا انتظام ایک ایسی سطح پر ہونے لگا ہے جسے سامراجی اور سامراج کے پٹھو ذلت انگیز شکست کہتے اور کہلاتے نہیں تھکتے۔ ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کا قیام عمل میں لایا گیا تو لاکھوں فلسطینی عرب آبائی گھروں سے نکال دیئے گئے۔ یہ خانماں برباد مہاجر کیمپوں میں ٹکریں مارتے چلے آ رہے ہیں۔ ان کیمپوں میں ایک اور نسل پیدا ہو کے جوان ہو گئی ہے۔ ۱۹۶۷ء میں ان کی تعداد میں اور اضافہ ہوا۔ ان کی تعداد ہی میں اضافہ نہیں ہوا، ان کے جذبۂ بغاوت و انتقام میں بھی شدت آ گئی ہے۔ اب یہ خانماں برباد، کفن بردوش اور سربکف ہو گئے ہیں۔ وہ ان شاہوں اور شیوخ کی طرف نہیں دیکھ رہے جو سامراج کے رحم و کرم پر رہے اور جنہوں نے اجزائے عرب کو یک جان نہیں ہونے دیا۔ یہ سب میدانِ جہاد میں آ گئے ہیں ـــ بچے، بوڑھے، مرد، عورتیں۔ یہ مجاہدین مقبوضہ فلسطین میں مصروفِ کار ہیں اور یہودی غاصبوں پر کاری ضربیں لگا رہے ہیں۔ جیسے خلافتِ عثمانی یوسیدہ ہو کے شکست سے دوچار ہوئی تو اس کے اندر سے جوانانِ تتاری نکلے اور انہوں نے نئے ترکی کی داغ بیل ڈالدی۔ اسی طرح "حرکتِ تحریرِ فلسطین" (الفتح) کے یہ جانباز اپنے خون سے نئے فلسطین نئے عرب کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔ اب عربوں کا کردار ان کا کردار ہے!

ان مجاہدین کو الجزائر سے کہیں زیادہ ویت نام کی میزان میں تولا جا سکتا ہے۔ ویت نامی حریت پسندوں نے جنگِ آزادی شروع کی تھی تو بچوں کا کھیل دکھائی دیتا تھا۔ لیکن پہلے انہوں نے فرانس کو ذلت ناک شکست دے کر اپنے ہاں سے نکالا اور اب انہوں نے امریکہ جیسی ہیبت ناک طاقت کا جینا حرام کر دیا ہے۔ اسرائیل نے بھی فلسطینی مجاہدوں کو قابلِ اعتنا نہیں.. سمجھا تھا لیکن اب ان کی تلاش میں وہ کبھی مصر کو کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے کبھی اُردن کو، کبھی شام کو کبھی لبنان کو۔ عربوں کی شکست سے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کرنے والے ان کو ہزار خاطر میں نہ لائیں لیکن یہ تحریک اس لحاظ سے بین الاقوامی حیثیت اختیار کر چکی ہے کہ اسے دنیا کی تیسری بڑی طاقت یعنی عوامی جمہوریہ چین کی پوری پوری حمایت حاصل ہے۔ چین انہیں اخلاقی و مادی مدد پوری فیاضی سے دے رہا ہے۔ وہ ان مجاہدین کی جنگی تربیت بھی کر رہا ہے اس کا مطلب ایک یہ ہے کہ چین کو استعمار اور استحصال کے خلاف نبرد آزما ہونے کا جو غیر معمولی تجربہ حاصل ہے اس کا مجاہدین کو پورا پورا فائدہ پہنچے گا، اور دوسرا یہ کہ عالمِ عرب میں وہ سرچشمہ دریافت ہو گیا ہے جس سے عوامی قیادت کا دھارا پھوٹے گا اور کشتِ عرب کو جل تھل کر دیگا۔ شاہانِ عرب نہ یہ قیادت مہیا کر سکتے تھے، نہ انہوں نے کی۔ عربی افواج نے انہیں ٹھکانے لگا کے بڑا کام کیا لیکن نئی قیادت کا آبِ حیات شکست کی ظلمات میں حاصل ہوا۔ عربوں کی شکست کو عظیم المیہ کہہ کے عربوں کو رسوا کرنے اور ان کے دوستوں کو بد دل کرنے والے اس راز کو سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہونگے کہ رات کی تاریکی کے سینے سے صبح کا اجالا پھوٹ سکتا ہے اور پھوٹ کے رہتا ہے لیکن فلسطین کے المیئے سے نئی عوامی، انقلابی قیادت کا اجالا ہماری آنکھوں کے سامنے پھوٹتا دکھائی دے رہا ہے۔ عالمِ عرب بقعۂ نور بن رہا ہے اور بن کے رہے گا ۔۔۔ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ!

ٹیوشن درکار ہے

ایک ایم۔ اے تجربہ کار استاد کے لئے جو بی۔ اے تک کے طلبا کو فارسی، اردو اسلامیات اور انگریزی پڑھا سکتا ہے، ٹیوشن درکار ہے۔ ذیل کے پتہ پر رابطہ قائم کر کے مزید معلومات حاصل کریں۔

(ص) معرفت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵/بی گلبرگ ۲۔ لاہور